تفسیر

سورۃ عبس

سُورَۃُ عَبَسَ

مَکِّیَّۃٌ آیات: ۴۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی ﴿۱﴾ اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی ﴿۲﴾ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰٓی ﴿۳﴾ اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی ﴿۴﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ﴿۵﴾ فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی ﴿۶﴾ وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی ﴿۷﴾ وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی ﴿۸﴾ وَھُوَ یَخْشٰی ﴿۹﴾ فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَہّٰی ﴿۱۰﴾

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا۔ اس پر کہ ایک اندھا اس کے پاس آیا۔ اور تجھے کیا معلوم، شاید وہ سدھرنا چاہتا ہو۔ یا دھیان کرنا چاہتا ہو تو اسے یاد دلانا مفید ہوتا۔ جو بے پروائی کرتا ہے۔ اس کے تو، تو پیچھے پڑا ہے۔ حالانکہ تجھ پر کچھ الزام نہیں اگر وہ پاکیزہ بننا نہیں چاہتا۔ اور جو تیرے پاس دوڑ کر آتا ہے ڈرتا ہوا۔ اس سے تو تغافل کرتا ہے۔

۱۔ سورہ کا عمود اور موقع اور ماقبل سے اس کا تعلق

یہ سورہ منذرات میں سے ہے۔ یعنی ان سورتوں میں سے ہے جو مخاطب کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ ابتدائے بعثت کی اکثر سورتوں کا یہی حال ہے۔ البتہ ان کے اسلوب بیان مختلف ہو گئے ہیں۔ مثلاً اسی سورہ میں انذار کا ایک نیا پہلو یہ اختیار کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم کو ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روکا گیا ہے جو انکار اور نافرمانی پر لڑے ہوئے ہیں اور کسی طرح اپنی جگہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ پھر اسی مضمون سے متعلق آگے چل کر، کچھ اور باتیں آ گئی ہیں۔ مثلاً چند لفظوں میں ان کی ہٹ دھرمی پر ملامت ہے۔ پھر ان کی ضد اور بے پروائی کی خرابیاں بیان ہوئی ہیں، پھر ان کے انجام کی تفصیل ہے اور آخر میں مقابلہ کے اسلوب پر ان لوگوں کا بھی ذکر آیا ہے جنھوں نے ان سے الگ ہو کر ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کر لی ہے۔ اس اسلوب کے چند فوائد قابل ذکر ہیں۔ مثلاً،

۱۔ توضیح مطلب کے لیے مخالف پہلو کا ذکر مفید ہوا کرتا ہے۔

۲۔ اس میں ترہیب کے ساتھ ترغیب کا پہلو بھی پیدا ہو گیا ہے جو ایک جامع اور موثر انداز کلام ہے۔

۳۔ اس میں آنحضرت صلعم کو اشارہ ہے کہ آپ کی توجہ کے اصلی مستحق مومنین ہیں نہ کہ کفار۔ مومنین کا حق مقدم ہے۔

سابق سورہ سے اس کا ربط یوں ہے کہ اس کے خاتمہ کی آیت اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا تھی۔ یعنی تمھاری نصیحتوں کو وہی قبول کر سکتے ہیں جو قیامت سے ڈرتے ہیں۔ پس اس سورہ میں یہ بتا دیا کہ پیغمبر ایسے لوگوں سے اصرار و لجاجت کرنے پر مامور نہیں ہے جو قیامت کے خوف سے بے پروا ہو چکے ہوں۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار دہرایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم انتہائی رافت و شفقت کے سبب سے، یا جوش تبلیغ و دعوت میں، کبھی کبھی اصرار و لجاجت پر اتر آتے تھے۔

یہاں بھی وہی مضمون ہے۔ قرآن مجید نے تعلیم کو موثر اور دل نشین بنانے کے لیے، نابینا کے مناسب حال واقعہ کو بطور مثال اختیار کر لیا ہے اور پیغمبر صلعم کو تبلیغ و دعوت میں اصرار کی اس حد سے روکا ہے جو آپ کے منصب کے شایانِ شان نہیں ہے اور گو کلام کا ظاہر اسلوب تنبیہ و عتاب کا ہے لیکن درحقیقت ان تمام مواقع میں جہاں آنحضرت صلعم کو منکرین سے اعراض کا حکم دیا جاتا ہے، غصہ و عتاب کا اصلی رخ پیغمبر صلعم کے بجائے منکرین ہی کی طرف ہوتا ہے۔ اور یہ اتمام دعوت کا ایک نہایت معروف اسلوب ہے جس سے اہل نظر ناواقف نہیں ہو سکتے۔

سورہ کی یہ تاویل جو بالاجمال اوپر بیان ہوئی بالکل واضح ہے اور کسی صاحب بصیرت کو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی لیکن بعض مفسرین سے اس کی تاویل میں لغزش ہو گئی ہے جس کو ہم آگے بیان کریں گے لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ایک فصل میں انبیاء کے خلق عظیم پر روشنی ڈالیں اور یہ واضح کر دیں کہ کبھی کبھی جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بانداز عتاب مخاطب کیا جاتا ہے، تو اس عتاب کا اصلی پہلو کیا ہوتا ہے۔

۲- انبیاءؑ کا خلق عظیم، ان کی عصمت اور ان کے مواقع عتاب

عقل و نقل کے تمام پہلوؤں سے یہ بحث طے پا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ فرض رسالت کی ادائیگی کے لیے انھیں لوگوں کو چنا ہے جو اس کی مخلوق میں اخلاق و تقویٰ کے لحاظ سے نقطۂ کمال پر ہے چنانچہ فرمایا ہے وَاللّٰهُ يَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا بوجھ کس پر ڈالے۔ حضرت سرور کائنات کی نسبت فرمایا وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" (بے شک تم ایک خلق عظیم پر ہو) اس مضمون کی توضیح صحیحین کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا اور بقیہ تمام مخلوق کو دوسرے پلڑے میں، جب آپؐ تمام مخلوق پر بھاری ثابت ہوئے تب آپؐ کا انتخاب فرض رسالت کی ذمہ داریوں کے لیے عمل میں آیا۔

اس برگزیدگی کے بعد اللہ تعالیٰ انبیاء کی تربیت فرماتا ہے، ان کو اپنے امر و نہی سے مطلع فرماتا ہے، اور جن چیزوں سے وہ ناواقف ہوتے ہیں ان کو ان کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اس کے اشاروں پر چلتے، اور اس کی نگاہوں میں رہتے ہیں،

چنانچہ فرمایا ہے فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا بیشک تم ہماری نگاہوں میں ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔

فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ۔ (جن - ۲۷-۲۸)	پس وہ ان کے آگے اور پیچھے پہرہ رکھتا ہے تاکہ وہ دیکھ لے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے اور ان کے سارے معاملات اس کے احاطہ میں ہیں اور اس نے ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے۔

یعنی عالم غیب کی ایک مخصوص نگاہ انبیاء کرام کی نگرانی کرتی رہتی ہے اور ان کو لغزشوں سے بچاتی ہے قبل اس کے کہ وہ کسی غلط راہ پر قدم رکھیں خدا کا ہاتھ ان کی رہنمائی کے لیے نمودار ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی وہ کسی پر خطر راہ میں نکل جاتے ہیں تو صرف اتنی دیر تک کے لیے ان کو وہاں چھوڑا جاتا ہے جتنی دیر میں وہ اپنے فرض نبوت اور منصب دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں کو ادا کر لیں، اس سے زیادہ ان کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اور یہ بھی اس لیے کہ ایسا ہونا اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کے قانون آزمائش کا اقتضا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے آزمائش کا قانون رکھا ہے اور یہی قانون ان کے باطن کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔

پس جب کبھی اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ اس کے رسول کے قدم کسی ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں لغزش کا اندیشہ ہے تو وہ فوراً اس کو متنبہ کر دیتا ہے۔ اور اگر وہ جوش و انہماک میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تو بعض اوقات نہایت کھلے لفظوں میں بلکہ بانداز عتاب اس کو روکا جاتا ہے۔ تاکہ جس چیز سے منع کیا جا رہا ہے اس کی اصلی اہمیت اس کے سامنے واضح ہو جائے۔ پیغمبر اس وقت چونک جاتا ہے اور سامنے کے خطرہ کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ اگر خدا کے غیر مرئی ہاتھ نے رہنمائی نہ کردی ہوتی تو وہ تو بالکل خطرہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یہ چیز اس کے شکر و انابت کے جذبہ میں ایک جوش پیدا کرتی ہے اور وہ خضوع و خشوع کی تمام نیازمندیوں کے ساتھ اپنے پروردگار کے سامنے گر پڑتا ہے اور اس سے اور زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح بچہ ماں کے ڈرا دینے کے بعد اس کے سینے سے اور زیادہ چمٹ جاتا ہے۔

الغرض پیغمبر کا رجحان ہر حالت میں بھلائی اور نیکی ہی کی طرف ہوتا ہے۔ اس کا دل ہوا و ہوس کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہوتا ہے۔ اس کا ہر قدم صرف مرضیات الٰہی کی راہ میں اٹھتا ہے لیکن اسی راہ میں کبھی کبھی وہ افراط کی حالت اختیار کر لیتا ہے تو جب کبھی ایسا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو حق و اعتدال کی بیچ راہ پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ کیونکہ پیغمبر اپنی قوم کے لیے نمونہ ہوا کرتا ہے۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات پیروی و اقتدا کے لیے ہوتی ہے پس اس کے کسی عمل میں اگر افراط کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا گیا تو اس سے تمام امت کی راہ کج ہو سکتی ہے۔

اس افراط کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کے باطن سے بے خبر ہوتا ہے۔ باطن کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اس بے خبری کے سبب سے پیغمبر کبھی کسی شخص کی اصلاح سے مایوس نہیں ہوتا۔ کوئی شخص انکار و سرکشی کی کتنی ہی سخت و شدید حالت اختیار کر لے لیکن وہ ایک غمگسار دوست اور ایک ہمدرد طبیب کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ظاہر نہ کر دیا جائے کہ فلاں شخص اللہ کا دشمن ہے، ایمان نہ لائے گا، وہ اس کے

ایمان وہدایت سے مایوس نہیں ہوتا۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ خود اعلان کر دیتا ہے کہ فلاں شخص اللہ کا دشمن ہے، اب اس پر ایمان وہدایت کی راہ باز نہ ہوگی، اس سے علیحدگی اختیار کر لو تو وہ اس سے برأت کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس معاملہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ قرآن مجید نے متعدد مقامات میں بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ (التوبہ-۱۱۴)

پس جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ وہ (آذر) اللہ کا دشمن ہے وہ اس سے علیحدہ ہوگیا۔ بیشک ابراہیم بہت ہی دردمند اور بردبار تھا۔

کبھی کبھی اس کے برعکس حالت بھی پیش آتی ہے یعنی پیغمبر کسی جماعت کی سرکشی اور اس کے تمرد کو دیکھ کر اس کے ایمان وہدایت کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ جماعت ابھی اس حد کو نہیں پہنچی ہوتی ہے کہ اس سے مایوس ہو جایا جائے، اس کے جینے اور پنپنے کی ایک ہلکی سی آس باقی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ہے۔

اس طرح کے واقعات پیش آنے کی وجہ یہی ہے کہ پیغمبر دلوں کے حال سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ ظاہر کو دیکھ کر ایک فیصلہ کرتا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے معاملات میں فیصلہ کا انحصار باطن کی حالت پر ہوا کرتا ہے۔ پس اس معاملہ میں صرف علام الغیوب ہی کا فیصلہ اصل فیصلہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات وہ کسی جماعت سے اعراض کا حکم دے دیتا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھ لیتا ہے کہ اب یہ جماعت ایمان نہیں لانے کی۔ اور بعض اوقات کسی مخصوص جماعت کے اندر دعوت کو لگاتار جاری رکھنے کا حکم دیتا ہے کیونکہ ابھی اس کے اندر صلاحیت کی گرمی موجود ہوتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ پیغمبر کی باگ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ کبھی اس کو آگے بڑھاتا ہے، کبھی روک لیتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں ایک خاص اصول حکمت پر مبنی ہوتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی نعمت ایسے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے جو کسی طرح اس کے مستحق نہیں ہوتے۔ ایسے مواقع پر اس کو اعراض کا حکم دیا جاتا ہے اور اس کو اس مفرط جوش دعوت پر پُر محبت عتاب کیا جاتا ہے۔ اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ کسی قوم کی سرکشی و نافرمانی سے اس کو غیرت حق لاحق ہو جاتی ہے اور وہ ان سے بیزار ہو کر علیحدہ ہو جانا چاہتا ہے، ایسے مواقع پر اس کو بانداز عتاب حکم ہوتا ہے کہ ان کے اندر تبلیغ و دعوت کا جہاد جاری رکھے اور جب تک حکم خداوندی نہ ہو، وہ حق کو کتنی ہی بیدردی کے ساتھ ٹھکرائیں لیکن وہ ان کو نہ چھوڑے۔

غرض کبھی اس کے کمال رحمت و شفقت پر عتاب ہوتا ہے اور کبھی کمال غیرت حق پر۔ اور یہ دونوں حالتیں ایسی ہیں جو نفس کی آلائشوں سے پاک ہیں۔

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

عَبَسَ | منہ بنایا، تیوری چڑھائی، ترش رو ہوا۔ اس کی مزید تشریح تَوَلّٰی نے کر دی۔ تَوَلّٰی یعنی اعراض کیا۔

اَنْ جَآءَهُ | میں "لان جاءہ" ہے۔ یہ ترش رو ہونے کا سبب بیان ہوا کہ دراصل ترش روئی کا باعث اس وقت نابینا کا آنا تھا، نہ کہ اس کی ذات۔ مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

اَلْاَعْمٰی | نابینا۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ یہاں مراد ابن ام مکتومؓ ہیں۔ ان کا نام بھی لیا جا سکتا تھا لیکن اس صفت کے ساتھ ذکر کرنے سے ایک طرف تو ان کے ضعف و احتیاج کی حالت ظاہر ہوگئی دوسری طرف یہ معلوم ہوا کہ وہ آنحضرت صلعم کی اس وقت کی مشغولیت سے بالکل لاعلم تھے۔ پس مقتضائے حال کی بے شمار بلاغتیں اس لفظ کے اندر پنہاں ہیں۔

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى | ما یدریك کا مفعول یہاں محذوف ہے۔ اس کا قائم مقام لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى ہے۔ یہ حسب قاعدہ مقابلہ مفعول محذوف کا خود پتہ دے رہا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے "وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ" یعنی تمہیں کیا خبر کہ قیامت بہت دور ہے۔ شاید وہ قریب آ گئی ہو۔ دیکھو لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ کے ٹکڑے نے اصل مفعول کی طرف خود انگلی اٹھا دی کیونکہ جملہ کی نوعیت مقتضی ہے کہ اس کا ایک مقابل یہاں محذوف مانا جائے۔ پس آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ تمہیں کیا معلوم کہ اس کا آنا سدھار اور دھیان کے لیے نہیں ہے کہ تم کفار کے طعنہ کی شرم میں پڑ گئے کہ وہ کہیں گے "محمد کے پیرو اندھے اور عاجز لوگ ہیں جو بے وقوفی اور طمع کی وجہ سے ان کی باتوں میں آ گئے ہیں پس ہم ان کی پیروی کر کے ایسوں کی رفاقت کا ننگ کیسے گوارا کر سکتے ہیں۔"

اس سے صاف واضح ہے کہ آنحضرت صلعم کو بالکل علم نہیں تھا کہ ابن ام مکتومؓ اس وقت تعلیم و تزکیہ کا کوئی مقصد لے کر آئے ہیں۔ آپ کو جو چیز ناگوار ہوئی وہ محض ان کا اس وقت کا آنا تھا اور اس کا باعث وہی خیال تھا جو اوپر بیان ہوا۔ باقی رہی یہ بات کہ ابن ام مکتوم نے آنحضرت صلعم سے تعلیم قرآن کی درخواست کی اور آپؐ نے اعراض فرمایا تو یہ بات از روئے روایت بھی ثابت نہیں ہے۔ اور از روئے قرآن تو اس کے ضعف کا جو حال ہے وہ نمایاں ہی ہے۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

يَزَّكّٰى | سدھرنا چاہتا ہو۔ یعنی آنحضرت صلعم کی صحبت اور آپؐ کی دعا کی برکت سے۔

يَذَّكَّرُ | دھیان کرنا چاہتا ہو۔ یعنی قرآن سے اور پیغمبر کی نصیحتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو۔

اسْتَغْنٰی | بے پروا ہوا — یعنی تزکیہ و تذکر اور انابت و خشیت سے — ان چیزوں کا ذکر اس لیے حذف کر دیا کہ ماقبل و مابعد کا تقابل خود اس پر دلیل تھا۔

تَصَدّٰى | دراصل تتصدد تھا۔ یہ صدد سے ہے جس کے معنی متوازی اور متقابل کے ہیں۔ عام بول چال میں کہتے ہیں داری بصدد دارہ (میرا گھر اس کے گھر کے مقابل میں ہے) پس تَصَدّٰى کے معنی ہوئے تعرض کرنے کے۔ یہ تَوَلّٰی کا ضد ہے۔

وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى | یعنی اگر وہ سدھرنا نہ چاہے تو اس کا بار الزام تم پر نہیں۔

يَسْعٰى | وہ دوڑ کر آتا ہے — لیکن اس دوڑ کر آنے سے وہ دوڑنا مراد نہیں ہے جو پاؤں سے ہوا کرتا ہے یہ دل کے بیتابانہ شوق کے لیے ایک پر کنایہ طریقہ تعبیر ہے۔ موقع کلام اس پر دلیل ہے نیز وَهُوَ يَخْشٰى سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔

يَخْشٰى | ڈرتا ہے — بظاہر ایک جامع اور مطلق لفظ ہے، لیکن اشارہ خوف قیامت کی طرف کر رہا ہے۔ سابق سورہ میں اس مضمون کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا (تم تو بس انہی کو ڈرا سکتے ہو جو قیامت سے خوف کھاتے ہیں)۔

تَلَهّٰى دراصل تَتَلَهّٰى ہے۔ تَلَهّٰى عَنْهُ کے معنی ہیں اس سے غافل ہوگیا الهانی عنه ذٰلك کے معنی ہوتے مجھے فلاں چیز نے اس سے پھیر لیا اور میں اس کی طرف توجہ نہ کر سکا۔ عقبہ بن بجیر کا شعر ہے :

لحافی لحاف الضیف والبیت بیته ولم یلهنی عنه غزال مقنع

(میرے دروازے پر اگر کوئی مہمان اتر پڑتا ہے تو میرا اوڑھنا بچھونا مہمان کا اوڑھنا بچھونا اور میرا گھر مہمان کا گھر بن جاتا ہے اور کوئی برقعہ پوش ہرنی (نازنین) مجھے اس سے غافل نہیں کرتی)

۴- ان آیات کا موقع نزول اور واقعہ کی اصلی تصویر

یہ آیتیں اس موقع پر نازل ہوئی ہیں جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آنحضرتؐ منکرین کے پیچھے زیادہ وقت ضائع نہ کریں اور اب اپنی تمام توجہ اور سرگرمی کا مرکز مسلمانوں ہی کو بنائیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ابتداء میں آنحضرت صلعم کو یہ حکم ہوا تھا کہ آپؐ سب سے پہلے اپنی قوم کے ان سرداروں کو دین حق کی دعوت دیں جو قوم میں دینی پیشوائی کے منصب پر متمکن ہیں اور ساتھ ہی آپؐ کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی تھی کہ اگر یہ لوگ اعراض کریں اور کفر و انکار پر جم جائیں تو آپؐ ان کو چھوڑ کر اپنا سارا وقت مسلمانوں ہی کی تعلیم و تربیت پر صرف فرمائیں۔ بعض ابتدائی آیات میں اس معاملہ کے تمام مراحل کی پوری تفصیل کر دی گئی تھی۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۝ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ۝ (الشعراء- ۲۱۴-۲۱۹)

اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو خدا کے عذاب سے ڈراؤ اور جن مومنین نے تمہاری پیروی کی ہے ان پر شفقت کرو، پس اگر (تمہارے رشتہ دار) تمہاری بات نہ مانیں تو تم کہہ دو کہ میں تمہارے فعل سے بری ہوں، اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ کرو، جو تم کو دیکھتا ہے جب تم اٹھتے ہو اور (دیکھتا ہے) نمازیوں میں تمہاری آمد و شد کو۔

اس ہدایت کے بموجب آنحضرت صلعم تبلیغ و دعوت میں مشغول ہوئے لیکن قوم کی طرف سے آپؐ کی دعوت کا جواب، تکبر اور گھمنڈ کے انکار کے ساتھ دیا گیا۔ تاہم آپؐ بددل نہ ہوئے، محبت کے جوش اور دعوت حق کی سرگرمی میں، اعراض و انکار کی ان تمام سختیوں کو جھیلتے رہے۔ آپؐ کو توقع تھی کہ یہ بیگانگی عارضی ہے، جلد وقت آئے گا کہ یہ لوگ آپؐ کی باتیں مان لیں گے، چنانچہ عناد و مخالفت کے ہیجان میں وہ لوگ جتنے ہی آپؐ سے دور ہٹتے جاتے آپؐ محبت و رافت کے جوش میں اسی قدر ان سے قریب ہوتے جاتے اور اس کے چند خاص اسباب تھے۔

اولاً محبت و شفقت کا وہ بے پایاں جذبہ جو رحمۃ للعالمین کی خاص صفت تھا، اور جس نے آپؐ کی نگاہوں میں دشمنوں کو بھی عزیزوں سے زیادہ محبوب بنا دیا تھا۔

ثانیاً رسالت عظمیٰ کے فرائض کی ذمہ داریوں کا احساس۔

ثالثاً یہ خیال کہ طاقتوروں اور دولت مندوں کا ایمان دین حق کی تائید و تقویت کا باعث ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہم اور بعض دوسرے سابقون الاولون کے ذریعے سے آپؐ کے اس خیال کی تصدیق فرما دی۔

رابعاً یہ اندیشہ کہ مبادا ادائے فرض کی راہ میں جو صبر و جہاد مطلوب ہے اس میں کسی طرح کی کوتاہی ہو جائے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ پر بالکل صحیح تھیں۔ رافت و رحمت کے بے پایاں جذبہ اور ادائے فرض کے حقیقی جوش کا تقاضا یہی تھا کہ آنحضرت صلعم ایسا ہی کرتے لیکن اس معاملہ کے بعض پہلو ایسے بھی تھے جو مقام نبوت کے شایان شان نہ تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس سے روک دیا۔ اولاً تو اس میں ان لوگوں کے حقوق سے تھوڑی سی بے پروائی کا اندیشہ تھا جو آپؐ کی توجہ کے اصلی مستحق تھے یعنی مومنین خالصین۔ ثانیاً اس سے نبوت کے اس وقار کو ٹھیس لگتی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے صرف سربلندی اور برتری ہی پسند کی ہے، کبھی اس کے لیے پستی کو پسند نہیں فرمایا ہے۔

اسی وجہ سے قرآن مجید میں آپؐ کو متعدد مقامات میں صرف مومنین صالحین کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو جانے کا حکم دیا گیا اور منکرین کے پیچھے زیادہ وقت ضائع کرنے اور ان پر غم کھانے سے روکا گیا ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (کہف ۶)

شاید تم ان لوگوں کے پیچھے مارے غم کے اپنی جان ہلاک کر ڈالو گے اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں گے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۲۸ - ۲۹ کہف)

اور (اے پیغمبر) اپنے آپ کو ثابت قدم رکھو، ان لوگوں کے ساتھ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی رضا طلبی میں اور دنیاوی زندگی کی زینت کی کھوج میں تمہاری نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں اور تم ان لوگوں کی بات پر کان نہ دھرو جن کے دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیے ہیں اور جنھوں نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے اور جن کا معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے۔ کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے۔ پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ (۵۴ الذاریات)

پس تم ان سے اعراض کرو، تم کو کوئی ملامت نہیں ہے

ان آیات سے واضح ہے کہ جب کبھی ایسا ہوا کہ جوش تبلیغ و دعوت میں آنحضرت صلعم نے انہماک و سرگرمی کی وہ حالت اختیار کر لی جو حد اعتدال سے کچھ بڑھتی ہوئی نظر آئی تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو روک کر جادۂ اعتدال پر کھڑا کر دیا۔ انہی حالات کے اندر اتفاق سے یہ ابن ام مکتومؓ والا واقعہ پیش آ گیا۔ وحی الٰہی تعلیم و تربیت کے لیے مناسب حال واقعات کی منتظر ہی رہتی تھی۔ پس یہ واقعہ ایک ایسی سورہ کے نزول کا سبب بن گیا جو دولت مندوں کی زجر و توبیخ، غریبوں کی مدح و ستائش اور دل شکستوں کی دلداری و ہمدردی پر ایک بلیغ ترین خطبہ اور جامع ترین موعظت بھی ہے، اور آنحضرت صلعم

تبلیغ و دعوت میں کبھی کبھی جو اصرار و الحاح کی شکل اختیار کر لیتے تھے اس پر بھی اس میں نہایت واضح لفظوں میں تنبیہ ہو گئی کہ آپ منکرین کے پیچھے اپنا وقت ضائع نہ کریں، وہ اپنی جگہ سے ہٹنے والے نہیں ہیں، صرف مومنین کی اصلاح و تربیت میں لگیں جو آپ کی شفقتوں کے اصلی مستحق ہیں۔

واقعہ کی اصلی صورت یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے پاس سادات قریش بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ ان کو تبلیغ و دعوت فرما رہے تھے۔ اسی بیچ میں ابن ام مکتومؓ آ گئے۔ آنحضرت صلعم کو اندیشہ ہوا کہ اب یہ لوگ بدک جائیں گے اور کہیں گے، تم نے چند اندھوں اور غریبوں کو لالچ دلا کر اور بیوقوف بنا کر پھنسا رکھا ہے اور اب ہمارے لیے دام بچھا رہے ہو، تو ہم تو اس وقت تک تمھارے پیرو نہیں بننے کے جب تک تم ان کو اپنی پیروی سے خارج نہ کرو، ہم اشرف ہو کر ان اراذل کی سطح پر کیسے اتر سکتے ہیں۔

آنحضرت صلعم کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا۔ سادات قریش اس خیال کو بار بار ظاہر کر چکے تھے۔ قرآن مجید نے کئی جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ (بقرہ ۱۳)

جواب دیتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح یہ بیوقوف ایمان لائے ہیں۔

دوسرے مقام پر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًاۢ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(الانعام ۵۱-۵۴)

اور اس کے ذریعہ ان لوگوں کو ہوشیار کرو جو ڈرتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس جمع کیے جائیں گے اور اس وقت خدا کے سوا نہ ان کا کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارشی، تاکہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں اور نہ دھتکارو ان لوگوں کو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی رضا جوئی میں۔ تم پر ان کی جواب دہی کچھ نہیں ہے اور نہ تمھاری جوابدہی کچھ ان پر ہے کہ تم ان کو دھتکار کر ظالموں میں بن جاؤ اور اسی طرح ہم نے بعض کو بعض سے آزمایا ہے تاکہ وہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے فضل کیا ہے۔ کیا اللہ شکرگزار بندوں کو نہیں جانتا اور جب تمھارے پاس آئیں وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں ہماری آیتوں پر تو کہو تم پر سلامتی ہو۔ تمھارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت واجب کر لی ہے کہ جو کوئی تم میں سے براہ نادانی کوئی برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور اپنی حالت کی اصلاح کر لے تو بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝ (الحجر ۹۴-۹۷)

پس تم کو جس بات کا حکم ملا ہے کھول کر سنا دو اور مشرکوں سے منہ پھیر لو۔ اور مذاق اڑانے والوں کے لیے جو اللہ کا ساجھی ٹھہراتے ہیں ہم تمھاری طرف سے بس ہیں بس عنقریب ان کو معلوم ہو جائے گا اور ہم کو معلوم ہے کہ تم ان کی باتوں سے دل تنگ ہوتے ہو۔

آنحضرت صلعم اپنی رافت و رحمت کی وجہ سے تمام غربا و مساکین کے ملجا و ماویٰ تھے اور بوجہ شدت غیرت یہ کبھی نہیں گوارا کر سکتے تھے کہ آپؐ کے ان صحابہؓ کی، جن کو کسی طمع دنیاوی نے نہیں بلکہ محض طلب رضائے حق نے آپؐ کے ارد گرد اکٹھا کر دیا ہے، کوئی توہین کرے۔ پس اس موقع پر عبداللہ بن ام مکتومؓ کے آ جانے سے آپؐ کو اصلی اندیشہ یہی ہوا کہ یہ مغرور لوگ ان کی پھٹی حالت دیکھ کر اس کو صحابہؓ پر زبان طعن دراز کرنے کا ایک بہانہ بنا لیں گے اور ان کی توہین کریں گے۔

پس آپؐ نے جو کچھ کیا غیرت حق اور مصلحت تبلیغ و دعوت کے تقاضے سے کیا لیکن اسی سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ آنحضرت جوش تبلیغ و دعوت میں اپنے حدود سے کسی قدر آگے نکل گئے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آپؐ کو متنبہ کر دیا کہ آپؐ نے اپنے فرض سے زیادہ ذمہ داری اٹھائی ہے۔ اور کلام کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا جس سے بظاہر عتاب مترشح ہوتا ہے، لیکن عتاب کا اصلی رخ کفار و منکرین کی طرف ہے، آنحضرت صلعم کی طرف نہیں۔ آپؐ کی تو اس میں تعریف کی گئی ہے اور ساتھ ہی آپؐ کے صحابہؓ کی بھی دلداری کی گئی ہے۔

اس معاملہ کی اصلی نوعیت کو ایک مثال سے سمجھو۔ فرض کرو ایک نہایت مستعد اور ذمہ دار چرواہا ہے۔ اس کے گلے کی کوئی فربہ بھیڑ گلے سے الگ ہو کر کھو جائے۔ چرواہا اس کی تلاش میں نکلے۔ ہر قدم پر اس کی کھر کے نشانات ملتے جا رہے ہیں۔ جنگل کے کسی گوشہ سے اس کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے اور اس طرح وہ کامیابی کی امید میں دور تک نکل جاتا ہے اور اپنے اصلی گلے سے تھوڑی دیر کے لیے غافل ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس لوٹتا ہے تو اس کا آقا اس کو ملامت کرتا ہے کہ تم پورے گلے کو چھوڑ کر ناحق ایک دیوانی بھیڑ کے پیچھے ہلکان ہوئے، اس کو چھوڑ دیتے، بھیڑیا کھا جاتا وہ اسی کی مستحق تھی۔ بتاؤ اس میں عتاب کس پر ہوا، چرواہے پر یا کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ ظاہر ہے کہ کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ چرواہے اور گلے کی تو اس میں زیادہ سے زیادہ دلداری ہوئی۔ بالکل یہی صورت معاملہ یہاں بھی ہے۔ عتاب کا روئے سخن بظاہر آنحضرت صلعم کی طرف ہے لیکن خفگی کا تمام زور منکرین و معاندین پر پڑ رہا ہے۔ آنحضرت صلعم کے لیے تو اس عتاب کے اندر شفقت و التفات کی نہایت جان نواز ادائیں پنہاں ہیں۔

تعجب ہے کہ سورہ کا یہ مفہوم نہایت واضح ہونے کے باوجود بعض مفسرین سے مخفی رہ گیا ہے اور وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں میں پڑ گئے۔ ہم آگے کی فصلوں میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔

۵- ایک غلط فہمی کا ازالہ

مجاہد سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم سرداران قریش میں سے کسی سے تخلیہ میں باتیں کر رہے تھے۔ آپؐ نے اس

کے سامنے اسلام پیش کیا تھا اور توقع تھی کہ وہ قبول کر لے گا۔ اسی بیچ میں حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ آ گئے۔ آنحضرتؐ کی ان پر نظر پڑی تو آپؐ کو ان کا ایسے وقت میں آنا ناگوار ہوا کہ یہ قرشی کہے گا کہ محمد کی پیروی اسی قسم کے اندھے بہرے اور غریب و بے نوا لوگ ہیں۔ اس پر یہ آیت اتری۔

یہ تاویل حضرت مجاہد کی تاویل ہے۔ اور جیسا کہ ہم پچھلی فصل میں بیان کر چکے ہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ سے یہ بالکل ظاہر ہے۔ لیکن بعض لوگوں کو اس واقعہ کے بارہ میں بعض غلط فہمیاں ہو گئی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ابن ام مکتومؓ نے آنحضرت صلعم سے تعلیم و ارشاد کی درخواست کی تھی اور آپؐ نے اس سے اعراض فرمایا اس پر یہ عتاب نازل ہوا۔

اس قول کو وہ بعض اکابر سلف سے منسوب کرتے ہیں، چنانچہ بعضوں نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ کسی قرشی سردار سے باتیں کر رہے تھے کہ اسی بیچ میں ابن ام مکتومؓ نے پہنچ کر درخواست کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے ان کی یہ بے توقع درخواست آپؐ کو ناگوار ہوئی اور اس پر یہ آیت اتری۔ بعض لوگ انہی حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ مجلس میں ابوجہل اور عتبہ بن ربیعہ جیسے سرداران قریش شریک تھے۔ بعض لوگ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلعم، عتبہ بن ربیعہ، عباسؓ بن عبدالمطلب، ابوجہل بن ہشام سے باتیں کر رہے تھے کہ ابن ام مکتوم نے آ کر درخواست پیش کی کہ عَلِّمْنِي مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ (اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو علم بخشا اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھائیے) آپؐ کو ان کی بے محل مداخلت ناگوار ہوئی اور اس پر یہ عتاب نازل ہوا۔ بعض لوگ حضرت ضحاک سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ اشراف قریش میں سے کسی سے گفتگو فرما رہے تھے کہ ابن ام مکتومؓ پہنچے اور انھوں نے اسلام کے متعلق بعض باتیں پوچھیں۔ بعض روایات میں ہے کہ ابن ام مکتومؓ ایسے وقت میں آنحضرت صلعم کے پاس پہنچے کہ آپؐ عتبہ و شیبہ سے باتیں کر رہے تھے۔ ایک اور روایت ابو مالک سے ہے کہ آپؐ کی گفتگو امیہ بن خلف سے تھی۔ بعض لوگوں نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلعم ابی بن خلف سے باتیں کر رہے تھے۔

ان تمام روایات پر غور کرنے سے ایک امر واضح ہے کہ یہ سب روایتیں ایسے لوگوں سے مروی ہیں جن میں سے کوئی بھی شریک واقعہ نہیں تھا۔ پس اگر ان کی صحت تسلیم بھی کر لی جائے تو بھی ان کی نوعیت استنباط کی ہو گی، خبر کی نہ ہو گی پھر ان میں باہم دگر اس قدر اختلاف ہے کہ ان کی حیثیت صرف اوہام کی رہ جاتی ہے۔ واہمہ نے ایک طویل اختراع کی اور جھوٹ اس کے لیے ایک قصہ کا جامہ تراش لیا گیا اور اس کی نسبت ان لوگوں کی طرف کر دی گئی جن کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ باعتبارِ سند یہ تمام روایتیں نہایت ضعیف ہیں، ان میں سے ایک روایت بھی قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ اور قرآن مجید سے بوجوہ ذیل ان کا غلط ہونا آشکارا ہے۔

۱۔ آیت کے الفاظ میں یہ کہیں نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم نے نابینا کو دیکھ کر تیوری چڑھائی یا اس کے سامنے ترشرو ہوئے (جیسا کہ بعضوں نے کہا ہے) اور اگر آپؐ ایسا کرتے بھی تو ایک نابینا کو اس ترشروئی کا کیا احساس ہو سکتا تھا؟ آپؐ کی آزردگی کا باعث محض ان کا آنا تھا کیونکہ اس سے ان سرکشوں کو موقع مل رہا تھا کہ آنحضرت صلعم کے صحابہ پر طعن کریں اور آپؐ کی مخالفت کا ایک بہانہ پیدا کر لیں۔ مکی زندگی میں آنحضرت صلعم کی تمام دعوت کا تعلق، توحید، معاد اور رد شرک سے تھا

اور یہ اس درجہ قطعی اور واضح مسائل تھے کہ مخالفین ان کے جواب میں اعتراض کا کوئی پہلو مشکل ہی سے پاتے تھے۔ اس وجہ سے ہمیشہ اس گھات میں رہتے کہ اگر مناظرہ کا کوئی موقع نہیں ملتا ہے تو مذاق اڑانے ہی کے لیے کوئی نکتہ ڈھونڈ نکالیں۔ اور اس میں شبہ نہیں ہے کہ عبداللہ بن ام مکتومؓ کے اس موقع پر آ جانے سے ان کی یہ غرض پوری ہو رہی تھی۔

۲۔ (وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ) اس امر پر نہایت واضح دلیل ہے کہ آنحضرت صلعم کو یہ بات بالکل نہیں معلوم تھی کہ نابینا کا آنا طلب علم اور حصول ہدایت کے لیے ہے۔ اگر یہ بات آپؐ کو معلوم ہوتی تو آپؐ نہایت خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتے۔ کیونکہ طلب علم و ہدایت سے بڑھ کر پیغمبر کو کوئی چیز بھی محبوب نہیں ہو سکتی۔ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ کے اسلوب سے یہی بات ٹپکتی ہے کیونکہ اس اسلوب کو اگر خوب پھیلا دو تو پوری بات یوں ہو گی کہ تم آزردہ ہوئے کہ اس کا آنا ایک ایسی حالت میں ہوا جو تمھیں ناپسند ہے حالانکہ تمھیں کیا خبر، ممکن ہے وہ اپنے ساتھ کوئی ایسا مقصد لے کر آیا ہو جس میں تمھارے دل کی اصلی خوشی پوشیدہ ہو۔

غرض قرآن مجید سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت صلعم کو یہ بات معلوم تھی کہ نابینا کا آنا تعلیم و استفادہ کے کسی دینی مقصد سے تھا اور اس کے باوجود آپؐ نے ناخوشی کا اظہار کیا۔

۳۔ (وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ) سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے کہ تبلیغ و دعوت کے کام میں آنحضرتؐ کا انہماک حدِ اعتدال سے آگے بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ اس پر آپؐ کو تنبیہ فرمائی گئی کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو اس کی بازپرس تم سے نہیں ہو گی کہ خواہ مخواہ ان کے ایمان کے لیے تم ان کے پیچھے پڑے رہو۔ اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں بہت ہیں مثلاً لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (تم ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو) فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا أَنتَ بِمَلُومٍ (تم ان سے اعراض کرو، اب تم پر کوئی الزام نہیں) فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (اگر وہ اعراض کریں تو کچھ غم نہیں تم پر تو صرف کھول کر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے)

ان آیات کا حاصل مطلب سامنے رکھ کر زیر بحث آیت پر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ اس میں بانداز عتاب آنحضرتؐ کے اس زائد بوجھ کو ہلکا کیا گیا ہے جو تبلیغ و دعوت کے عشق میں آپؐ نے اپنے سر پر اٹھا لیا تھا۔ یقیناً عتاب کا یہ انداز اس عتاب سے بالکل مختلف ہے، جو آنحضرت صلعم پر ہوتا اگر آپؐ نے واقعتہً کسی کمزور مسلمان سے بربناء تحقیر اعراض کیا ہوتا۔ پھر أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ کے ٹکڑے سے واضح ہے کہ سرداروں اور اغنیاء کی طرف آنحضرت صلعم کا التفات محض دعوت و تبلیغ کی خاطر تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ آپؐ غرباء کو حقیر سمجھتے رہے ہوں۔

۴۔ ان آیات کے بعد والے ٹکڑے یعنی كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ میں آنحضرت صلعم کو اس بات کی نہایت واضح الفاظ میں ہدایت کی گئی ہے کہ آپؐ ان لوگوں سے بالکل بے پروا ہو جائیں جو اللہ سے بے پروا ہو چکے ہیں اور ان کی دلجوئی کے لیے ہرگز اس قدر نیچے نہ اتریں جس قدر نیچے اترنا آپؐ نے گوارا فرما لیا ہے۔ پھر فرمایا أَمَّا مَن جَاءَكَ يَسْعَىٰ وَهُوَ يَخْشَىٰ فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ۔ اس سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلعم کا کفار کے ساتھ اس قدر مشغول ہونا نہ آپؐ کے شایانِ شان ہے اور نہ کتاب الٰہی کے شایانِ شان ہے۔

۵۔ اگر ہم وہ تمام روایتیں تسلیم بھی کر لیں جن میں بیان کیا گیا ہے کہ ابن ام مکتومؓ قرآن مجید سیکھنے آئے تھے، یا کوئی مسئلہ پوچھنا چاہتے تھے، یا طلب ہدایت کے لیے آئے تھے، جب بھی یہاں آنحضرت صلعم پر کسی عتاب کا کوئی موقع نہیں ہے۔ آگے ہم اس اجمال کی وضاحت کریں گے۔

خلاصہ اس تفصیل کا یہ ہوا کہ ان آیات، اور ان کے پیش و عقب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں آنحضرت صلعم کو مغروروں سے بے پروائی اختیار کرنے اور تبلیغ و دعوت کے کام میں اپنے درجہ و مرتبہ کا لحاظ رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے اور نہایت بلیغ اسلوب عتاب میں آپؐ کو تبلیغ و دعوت میں حدِ اعتدال سے بڑھے ہوئے انہماک سے روکا گیا ہے۔ پھر اس میں آنحضرت صلعم کی دلداری، غربا کی دلجوئی اور مغروروں کی سرزنش کے نہایت لطیف پہلو ہیں جو آئندہ فصلوں میں آپ کے سامنے آئیں گے۔

۶۔ پہلی غلطی سے بڑی غلطی

صحیح تاویل کے واضح ہو جانے کے بعد ان باتوں کے ذکر کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی جو کیسر توہمات پر مبنی ہیں لیکن ہم ایک خاص امر کا ذکر یہاں محض یہ بتانے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ کمزور روایات پر اعتماد کرنے سے کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور ان سے کس درجہ احتیاط ضروری ہے۔

حضرت امام رازیؒ نہایت ذہین آدمی ہیں۔ وہ اس بات کو تو فوراً سمجھ گئے کہ یہاں آنحضرت صلعم پر خفگی اور عتاب کا کوئی موقع نہیں ہے لیکن چونکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر آنحضرت پر عتاب ہوا اس وجہ سے ان کو فکر ہوئی کہ کسی نہ کسی شکل سے عتاب کا کوئی موقع پیدا کریں۔ چنانچہ انھوں نے پورے مقدمہ کو ایک نئے اسلوب سے ترتیب دیا اور پھر وہ جن نتائج تک پہنچے ہیں ان کی تفصیل سننے کے قابل ہے۔

وہ پہلے سوال قائم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آنحضرت صلعم پر عتاب کیوں فرمایا حالانکہ مندرجہ ذیل وجوہ سے زجر و تنبیہ کے اصلی مستحق ابن ام مکتوم تھے نہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم؟

۱۔ مانا کہ ابن ام مکتوم نابینا تھے لیکن وہ سرداران قریش کے ساتھ آنحضرت صلعم کی گفتگو سن کر معاملہ کی اہمیت کا اندازہ کر سکتے تھے۔ پھر ایسی حالت میں ان کا بیچ میں مداخلت کرنا یقیناً آنحضرت صلعم کی تکلیف کا باعث ہوا ہوگا اور یہ معصیت ہے۔

۲۔ یہ مسلم ہے کہ اس وقت جو اہمیت سرداران قریش کے معاملہ کو حاصل تھی وہ اہمیت ابن ام مکتومؓ کے معاملہ کو حاصل نہ تھی۔ ابن ام مکتومؓ بقدر ضرورت آنحضرت صلعم سے فیض یاب ہو چکے تھے اور یہ کفار اب تک بالکل محروم تھے۔ اس وجہ سے یہ ابن ام مکتومؓ سے زیادہ توجہ کے مستحق تھے۔ پھر ان سرداران قریش کے اسلام سے بہتوں کے لیے قبول اسلام کی راہ کھل سکتی تھی۔ پس ایسی حالت میں ابن ام مکتومؓ نے مداخلت کر کے اسلام کی ترقی کے ایک نہایت مفید موقع کو ضائع کر دیا۔

۳۔ قرآن مجید میں وارد ہے: إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِن وَرَاءِ الْحُجُرَاتِ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ (الحجرات-۴) (جو لوگ تم کو حجروں کے باہر سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر ناسمجھ ہیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کو صحابہ کی تادیب و اصلاح کا اختیار حاصل تھا اور آپؐ برابر مختلف امور پر صحابہؓ کو زجر و تنبیہ فرمایا کرتے تھے، پھر ایک ایسے امر پر آپؐ کیوں معتوب ہوئے جس کا آپؐ کو اختیار حاصل تھا؟

حضرت امام رازیؒ ابن ام مکتومؓ کے مستحق زجر و تنبیہ ہونے کے اتنے وجوہ بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس موقع پر اتنے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ جواب کی تقریر یوں شروع کرتے ہیں۔

"ان اشکالات کے دو جواب ہیں۔

اول یہ کہ اگرچہ معاملہ کی اصل حقیقت وہی تھی جو اوپر مذکور ہوئی لیکن اس کی ظاہری شکل سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ آنحضرت صلعم دولت مندوں کو غریبوں پر ترجیح دے رہے ہیں۔ اس وجہ سے آپؐ پر عتاب ہوا۔"

ہمارے نزدیک یہ وجہ اگرچہ قباحت سے خالی ہے لیکن ضعف سے محفوظ نہیں ہے۔ یہاں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو غیب کو جانتا ہے، اس کو اچھی طرح علم تھا کہ صورت واقعہ کیا ہے، پھر اس کا عتاب ہمیشہ کسی بات سے روکنے کے لیے ہوتا ہے تو کیا یہاں پیغمبر صلعم کو صحابہ کی تنبیہ سے روکا گیا ہے۔ حالانکہ اس بات کی نہ صرف آپؐ کو اجازت حاصل تھی بلکہ یہ چیز آپؐ کے فرائض منصبی میں شامل تھی۔

امام رازیؒ کا دوسرا جواب یہ ہے کہ "آنحضرت صلعم کے فعل کے اس ظاہری نتیجہ پر عتاب نہ ہوا ہو بلکہ واقعتہً یہ بات ہوئی ہو کہ قرابت، شرافت، اور علوئے منصب کی وجہ سے آنحضرت صلعم کا دل ان سرداروں کی طرف مائل ہو گیا ہو اور ابن ام مکتومؓ چونکہ اندھے تھے اور رشتہ و قرابت کی کوئی وابستگی بھی آپؐ سے نہیں رکھتے تھے۔ نیز شرف خاندانی کے اعتبار سے بھی فروتر تھے۔ اس وجہ سے ممکن ہے آپؐ کے دل میں ان سے کچھ نفرت پیدا ہو گئی ہو اور اس پر عتاب ہوا ہو۔"

اس دوسرے جواب کی نسبت بجز اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ حضرت امام رازیؒ پر رحم فرمائے۔ ام مکتوم ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی خالہ تھیں۔ اس تعلق کے بعد شرف اور قرابت کی وہ کون سی بلندی باقی رہ گئی ہے جو ان کے بیٹے کو حاصل نہیں ہو گئی۔ پھر یہ کیسی درد انگیز بات ہے کہ ایک پیغمبر ایک شخص سے اس وجہ سے نفرت کرے کہ وہ اندھا ہے۔ ایک اندھے سے زیادہ ہمدردی و غمگساری کا حق دار کون ہے؟ اور اگر پیغمبر بھی اس سے نفرت کرے گا تو اس کی دلداری اور محبت کے لیے کون آئے گا۔ یہ بات تو ایک مومن کی شان سے بھی فروتر ہے۔ نبی اور رسول کا کیا ذکر۔

غور کرو۔ معاملہ کی نوعیت کس قدر عجیب و غریب ہے۔ امام رازیؒ پہلے تو ٹھیک بات سمجھ جاتے ہیں کہ یہاں آنحضرت صلعم پر عتاب کا کوئی موقع نہیں ہے لیکن پھر ان کو تفسیر کی وہ تمام روایتیں یاد پڑ جاتی ہیں جن میں آنحضرت کو مورد عتاب ٹھہرایا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک ایسی بات کہہ گزرے ہیں جس کو سن کر آدمی کا کلیجہ کانپ اٹھے۔ انھوں نے اس بات کا تو خیال رکھا کہ اللہ تعالیٰ کو بے محل عتاب کے الزام سے بچا لیں لیکن اس بات کو بالکل بھول گئے کہ ان کے جواب سے آنحضرت صلعم کے خلق عظیم کا دامن ایک سنگین الزام سے آلودہ ہو رہا ہے۔

لیکن یہ ساری مشکلات تفسیری روایات کی پیدا کردہ ہیں۔ جن لوگوں کی نظر قرآن مجید کے سیاق وسباق اور آنحضرت صلعم کے حالات زندگی پر ہے، ان کے نزدیک اس تاویل اور ان تمام ضعیف روایات کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔

۷۔ ان آیات کا ربط آگے سے

ان آیات کے اندر آنحضرت صلعم کو آپؐ کے بلند منصب کی طرف توجہ دلائی گئی تھی کہ آپ مغروروں اور سرکشوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے کوئی ایسی شکل اختیار نہ کریں جو آپ کے رتبہ سے فروتر ہو۔ اگر یہ سرکش اور ضدی لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ ان سے بے پروا ہو کر صرف ان مومنین کے ساتھ مشغول رہیں جو آپ کی توجہ کے اصلی مستحق ہیں۔ یہ مضمون مقتضی ہوا کہ یہاں مختصراً اس چیز کی رفعت شان بھی بیان کر دی جائے جو آپؐ پر نازل کی گئی ہے تاکہ یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جو لوگ ایسی گراں مایہ نعمت سے منہ پھیر رہے ہیں وہ ہرگز اس بات کے سزاوار نہیں ہیں کہ ان کو زیادہ اہمیت دی جائے چنانچہ فرمایا:

كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿۱۱﴾ فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُ ﴿۱۲﴾ فِى صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿۱۳﴾ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿۱۴﴾ بِأَيْدِى سَفَرَةٍ ﴿۱۵﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿۱۶﴾ قُتِلَ ٱلْإِنسَٰنُ مَآ أَكْفَرَهُ ﴿۱۷﴾ مِنْ أَىِّ شَىْءٍ خَلَقَهُ ﴿۱۸﴾ مِن نُّطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ ٱلسَّبِيلَ يَسَّرَهُ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ إِذَا شَآءَ أَنشَرَهُ ﴿۲۲﴾

کچھ نہیں! یہ ایک یاد دلانا ہے، سو جس کا جی چاہے اس کو یاد کرے، قابل ادب، بلند اور پاک اوراق ہیں، ذی مرتبہ، نیک منشیوں کے ہاتھ میں۔ برا ہو آدمی کا یہ کتنا ناشکرا ہے، اسے کس چیز سے بنایا؟ ذرا سے پانی سے اسے بنایا تو اس میں اندازہ رکھا۔ پھر اس کی راہ اسے آسان کر دی۔ پھر اُسے مردہ کیا پھر اسے قبر میں رکھوایا۔ پھر جب چاہے گا اسے اٹھائے گا۔

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

كَلَّآ تبلیغ ودعوت میں آنحضرت صلعم نے جو غیر معتدل حالت اختیار کر لی تھی، اور جس پر آپؐ کو اوپر کی آیت میں تنبیہ فرمائی گئی تھی، کَلَّآ اس کو مزید مؤکد کر رہا ہے۔ یعنی بے نیازی کی تعلیم کو یہ لفظ اور زیادہ زور وقوت کے ساتھ نمایاں کر رہا ہے۔ اس کا پورا مضمون گویا یہ ہوگا کہ تمھیں ہرگز زیبا نہیں ہے کہ تم ان سے اس قدر چمٹو۔ بعد کے ٹکڑے سے اس کی پوری توضیح ہو جاتی ہے۔

إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ اوپر لفظ ذِكْرَىٰ گزر چکا ہے، ضمیر اسی کی طرف لوٹتی ہے۔ اس سے مراد قرآن اور اس کی آیات ہیں۔ پہلے ذِكْرَىٰ کا لفظ تھا، بعد میں تَذْكِرَة کا لفظ آیا، ان دونوں کی رعایت سے ضمیر مؤنث لائی گئی۔ یہ جملہ دلیل کے موقع میں ہے۔ لفظ کَلَّآ میں تعلیم استغناء کا جو مفہوم مضمر تھا، اس ٹکڑے نے اس کو کھول دیا اور یہ واضح کر دیا کہ ان کفار کے ساتھ کیوں بے نیازی کی روش اختیار کرنی چاہیے۔

فَمَن شَآءَ ذَكَرَهُ یعنی جو یاد دہانی تم ان کو سنا رہے ہو جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے۔ یہاں چونکہ صرف مفہوم کا خیال رکھا ہے اس وجہ سے ضمیر مذکر کی لائے۔ کیونکہ ذہن خود بخود قرآن کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

یہ جملہ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ کی تشریح کر رہا ہے۔ یعنی قرآن محض ایک یاد دہانی اور پیام ہے، جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے جس کا جی چاہے انکار کر دے، نہ اس میں کسی جبر کو دخل ہے اور نہ اس کے لیے کسی منت وسماجت کی حاجت ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار بیان ہوا ہے۔ اس جملہ میں نہایت اختصار ہے۔ بات کا صرف ایک حصہ مذکور ہوا ہے مقابل کا دوسرا حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ جو حصہ مذکور تھا وہ خود محذوف کو واضح کر رہا تھا۔ اگر اس محذوف کو کھول دیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی۔ سو جس کا جی چاہے یاد کرے اور جس کا جی نہ چاہے نہ یاد کرے۔ بعض مواقع پر اس مضمون کی تشریح بھی ہو گئی ہے۔ مثلاً فَمَن شَآءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے)

صُحُف جمع ہے صحیفة کی۔ صحیفہ کے معنی ہیں لکھا ہوا ورق۔ صحیفة المتلمس، صحیفة الجود وغیرہ نام اسی معنی کے اعتبار سے پڑے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لفظ صفیحہ سے مقلوب ہے۔ صفیحہ چوڑی چکلی چیز کو کہتے ہیں۔ صفیحة الحجر، صفیحة السلف، صفیحة العنق نہایت مشہور استعمالات ہیں۔ لفظ اپنی جمع کی صورت میں بعض اوقات، کتاب کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ مثلاً رَسُولٌ مِّنَ ٱللَّهِ يَتْلُوا۟ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً۔ فی صحف دراصل ھو فی صحف ہے۔ اوپر جس شے کا ذکر ہوا تھا اب اس کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں۔ اوصاف مابعد کے بیان میں مسند الیہ کا حذف ایک معروف اسلوب ہے۔ قرآن مجید میں اس کے شواہد بہت ہیں۔ کسی مقام پر ہم اس مسئلہ کو واضح کر چکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن کی ان صفتوں پر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر بھی بعینہٖ وہی حقیقت بول رہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ یعنی یہ قرآن جو اپنے رتبہ اور درجہ کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے۔ اس کو اس منت سماجت کے ساتھ پیش کرنا ہرگز اس کے شایان شان نہیں ہے۔ پس آنحضرت صلعم کو کفار کے ساتھ بے پروائی کی روش اختیار کرنے کی جو تعلیم دی گئی تھی، قرآن کی ان صفات نے اس کی دلیل بیان کر دی ہے۔

مَّرْفُوعَةٍ اس لفظ میں معنی اور درجہ دونوں قسم کی بلندیوں کا مضمون پنہاں ہے، دوسرے مقام میں اس کی تشریح ہو گئی ہے

مثلاً وَاِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ (اور یہ ہمارے پاس اصل کتاب میں ہے بلند اور پر حکمت) دوسری جگہ فرمایا قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ (قرآن بزرگ کی قسم) اور یہ دونوں مضمون درحقیقت لفظ مُكَرَّمَةٍ ہی کی تشریح ہیں۔

مُّطَهَّرَةٍ | یہ صفت بھی درحقیقت صفت تکریم ہی کے ایک پہلو کو واضح کر رہی ہے۔ یعنی قرآن مجید شیاطین اور ارواح خبیثہ کی دسترس سے بالکل محفوظ ہے۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ بیان فرمایا ہے فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ لَّا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (محفوظ کتاب میں، اس کو ہاتھ نہیں لگاتے ہیں مگر پاکیزہ لوگ) ایک اور مقام میں ہے بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (بلکہ یہ بزرگ کتاب ہے لوح محفوظ میں) اور جہاں جہاں قرآن مجید کو کتاب عزیز کہا ہے اس میں بھی عموماً اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

سَفَرَةٍ | سافر کی جمع ہے، بمعنی قاری و کاتب۔ سفر کے معنی پڑھنے اور لکھنے کے ہیں۔ یہ لفظ عبرانی میں بھی باقی ہے اس کے اصل معنی زخم لگانے کے ہیں۔ اسی سے لکھنے کا مفہوم پیدا ہوا۔ کیونکہ ابتدا میں جب کوئی چیز لکھنا چاہتے تو اس کو آہنی قلم سے کسی چیز پر کھودتے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ لفظ پڑھنے اور بیان کرنے کے معنوں کے لیے وسیع ہو گیا عبرانی میں ספר (سفر) قرأت و کتابت، اور زخم لگانے کے معنی میں موجود ہے اور סופר (سافر) کاتب، فقیہ، امام اور قائد کے معنوں میں آتا ہے۔ اس لحاظ سے حضرت قتادہؓ کا یہ فرمانا بالکل صحیح ہے کہ سفرہ سے مراد قراء ہیں۔ نیز حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ سفرہ نبطی میں قراء کو کہتے ہیں۔ زخم لگانے کے معنی میں یہ لفظ ہماری عربی زبان میں بھی مستعمل ہے۔ رؤبہ کا مصرع ہے:

تسفیر موسٰی المصلع الجلام

اسی طرح کتب کا مادہ عربی زبان میں اپنے اصل معنی میں باقی رہ گیا ہے۔

كِرَامٍ | یعنی اس امانت کے لیے پوری طرح قابل اعتماد ہیں۔ ان کی شرافت کی وجہ سے ان پر کسی طرح کا شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

بَرَرَةٍ | بار کی جمع ہے۔ بار اس شخص کو کہتے ہیں جو فرمانبردار اور اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے والا ہو۔ اس صفت نے ان کی امانت داری کے وصف کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔ اس مضمون کی طرف قرآن کی آیات اشارہ کر رہی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ (اس کو روح الامین لے کر اترے ہیں) تمام پر ہے اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ، ذِیْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِیْنٍ (یہ ایک باعزت رسول کا قول ہے، وہ قوت والا اور عرش والے کے نزدیک بلند مرتبہ ہے اس کی بات مانی جاتی ہے اور وہ معتمد ہے)

ان آیتوں کا مقصد قرآن مجید کی عظمت و شان کو بیان کرنا ہے کہ اس قدر بلند رتبہ اور اشرف چیز اس لیے نہیں ہو سکتی کہ وہ لوگوں کے سامنے منت و سماجت کے ساتھ پیش کی جائے اور لوگ اس سے اعراض کریں۔

علاوہ ازیں ان آیات سے قرآن مجید کی بعض نہایت اہم صفتیں روشنی میں آگئی ہیں مثلاً وہ اللہ تعالیٰ کے پاس لکھا ہوا ہے، پڑھا جاتا ہے، وہ ہر طرح کے اختلاط و امتزاج سے بالکل پاک ہے۔

ہاں ایک خاص بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہاں رفع، تطہیر، اور صحیفہ وغیرہ کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ تمام تر ایسے حقائق کی تعبیر کے لیے اختیار کیے گئے ہیں جن کا تعلق ملاء اعلیٰ سے ہے۔ ہم نے یہاں جو کچھ بیان کیا ہے وہ

صرف خلاصہ اور نتیجہ ہے۔ رہی ان کی اصلی تاویل و تصویر تو یہ چیز ملاء اعلیٰ کے احوال و معاملات کے شایان شان ہوگی۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ | الانسان کے لفظ سے عموماً انسانوں کا غالب حصہ مراد ہوتا ہے یعنی کفار۔ لیں یا تو اس لام کو لام عہد مانیے یا یہ مانئے کہ بلحاظ کثرت پوری نوع پر ایک حکم لگا دیا جاتا ہے۔ فرمایا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (انسان ظالم اور ناشکرا ہے) اس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔

(قُتِلَ) اصل حقیقت سے ہٹ کر محض اظہار غضب کے لیے استعمال ہوا ہے۔

(مَآ اَكْفَرَهٗ) میں اس غضب کا سبب بیان ہوا ہے اور انسان کی اس روش پر اظہار نفرت ہے۔

مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ | یہ استفہام تحقیر کے لیے ہے۔ اس کے بعد انسان کی حالت بیان ہوئی ہے۔ یہ ٹکڑا اس کی تمہید کے طور پر آیا ہے۔

نُطْفَةٍ | تھوڑا سا نچڑا ہوا پانی۔ ابوصعترہ بولانی کا شعر ہے۔

فما نطفة من حب مزن تقاذفت ... به جنبتا الجردی واللیل دامی

قرآن مجید میں ہے۔ ثم جعل نسله من سلالة من ماء مهين (پھر اس کی نسل جاری کی ذلیل پانی کے خلاصہ سے) اس لفظ کی حقیقت پر غور کرو اور دیکھو حشر و نشر کے بارہ میں جو استبعاد لوگوں کو نظر آتا تھا اس کو اس نے کس طرح دور کر دیا ہے۔ کیونکہ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ انسان کی ابتدائی خلقت ہی اس طور پر ہوئی ہے کہ اس کا مادہ مختلف گوشوں سے نچوڑ نچوڑ کر جمع کیا گیا ہے۔ پھر جب ایک بات زندگی کے ایک مرحلہ میں ممکن ہوئی تو وہی بات دوسرے مرحلہ میں کیوں ناممکن ہو جائے گی۔ اسی حقیقت کو سمجھانے کے لیے قرآن مجید نے ایک جگہ نہایت لطیف اشارہ اس طرح کیا ہے وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰی فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ (اور تم اپنی پہلی پیدائش کا حال تو جان ہی چکے ہو تو اس سے کیوں نہیں سبق حاصل کرتے؟)

فَقَدَّرَهٗ | یعنی اس کے اعضاء اور اس کی قوتوں کے نشو و نما کے لیے اپنی مرضی کے مطابق ایک اندازہ ٹھہرایا۔ اس سے مقصود انسان کی بے بسی و درماندگی اور خدا کے کمال تصرف و اقتدار کا اظہار ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ (اور جس صورت میں چاہا اس کو ترکیب دے دیا) اس میں اپنے کمال تصرف اور کمال قدرت کے علاوہ اپنے مخصوص فضل و احسان کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ اس نے اپنے حسن تقدیر سے انسان کو اپنی بہترین مخلوق بنا دیا۔ ایک آیت نے اس مضمون کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (اور اس نے تمہاری صورت گری کی اور خوب صورت گری کی) یہاں اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔ تفسیر سورۂ تین میں اس کی تفصیلات ملیں گی۔

السَّبِیْلَ | اس میں الف لام عہد کے لیے ہے۔ یعنی وہ راستہ جس پر انسان اپنے اعضاء اور قوتوں کی مدد و رہنمائی سے گامزن ہوتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے کہ اس نے اعضاء دیے اور قوتیں عنایت کیں اور پھر ان کے استعمال کرنے اور برتنے کا ڈھنگ بتایا اور اس کے لیے تمام اسباب و وسائل فراہم کر دیے۔ چنانچہ فرمایا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (جس نے خلق کیا پھر برابر کیا اور جس نے اندازہ ٹھہرایا پھر اس کی طرف رہنمائی کی)۔ اس سے زیادہ

واضح لفظوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی نقل فرمایا ہے۔ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر رہنمائی کی۔

اور یہ بات قرآن مجید نیز اصول فطرت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے سامنے خیر و شر دونوں کی راہیں کھول دی ہیں اور دونوں کے سمجھنے اور پرکھنے کے لیے عقل و بصیرت بخش دی ہے، انسان کو اختیار ہے کہ وہ ان میں سے جس راہ کو چاہے اختیار کرے اور جس کو چاہے نہ اختیار کرے۔ وہ کسی راہ کے اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ فرمایا:

فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا۔ (الدھر ۲-۳)

پس ہم نے اس کو سمیع و بصیر بنایا۔ بیشک ہم نے اس کو ہدایت دی راستہ کی طرف (موقع مقتضی ہے کہ یہاں راستہ سے مراد خیر کا راستہ لیا جائے) چاہے وہ شکر گزار بنے یا ناشکرا۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس)

اور دل اور جیسا اس کو بنایا، پس اس کو سمجھ دی بدی اور نیکی کی، کامیاب ہوا جس نے اسے صاف کیا اور ناکام ہوا جس نے اسے آلودہ کیا۔

اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ آدمی اپنی پسند سے اپنے لیے جو راہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے اسی راہ کو آسان کر دیتا ہے۔ اس قانون کو قرآن کی اصطلاح میں تیسیر کہتے ہیں۔ قرآن مجید اور عقل و نقل کی تمام شہادتیں اس بات پر متفق ہیں کہ یہ تیسیر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰی (اللیل)

سو جس نے سخاوت کی اور ڈر رہا اور اچھی بات کو سچ مانا، اس پر ہم سہج کر دیں گے آرام و چین والی اور جس نے بخالت کی اور بے پروائی کی اور اچھی بات کو جھٹلایا اس پر سہج کر دیں گے مشکل میں ڈالنے والی۔

پس اس مقام پر (ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ) کی تاویل یہ ہو گی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، اس کو برائی اور بھلائی کی تمیز دی اور اس کو اختیار بخشا کہ وہ ان دونوں راہوں میں سے جس راہ کو چاہے اپنے لیے پسند کرلے ان میں سے کسی راہ پر اس کو مجبور نہیں کیا۔ پھر اس کے تمام اعضاء اور اس کی تمام قوتوں اور تمام اسباب کو اس کے ارادہ کے ماتحت کیا۔ ان میں سے کسی چیز کو اس کے ارادہ پر حاکم نہیں بنایا اور یہ سب سے بڑی نعمت و سرفرازی ہے جو انسان کو اپنے پروردگار کی طرف سے حاصل ہوئی ہے۔ اس کی پوری تفصیل اپنے محل میں آئے گی۔

فَاَقْبَرَهٗ | قبرہ کے معنی ہیں اس کو دفن کر دیا۔ اور اقبرہ کے معنی ہیں اس کے لیے قبر بنائی۔

اَنْشَرَهٗ | کھول دیا۔ پھیلا دیا، چھینٹ دیا۔ باب افعال مبالغہ کے مفہوم کے لیے بھی آتا ہے۔ یہاں مطلب یہ ہو گا کہ دفن ہو جانے اور سڑ گل جانے کے بعد اس کو سیدھا اٹھا کھڑا کرے گا۔

۹- ان آیات کا باہمی نظم اور پیش و عقب سے ان کا تعلق

پہلے یہ بیان کیا کہ قرآن مجید نہایت بلند و برتر کتاب اور ارواح خبیثہ کی دسترس سے بالکل محفوظ ہے۔ اس کے بعد اس نعمت عظمیٰ سے انسان کی بے پروائی کی برائی کو واضح کرنے کے لیے اپنی قدرت کاملہ کے پہلو بہ پہلو انسان کی بے بسی اور اس کی بے حقیقتی کا حال بیان کیا تاکہ انسان اچھی طرح دیکھ لے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام عنایات کے باوجود خود اس کی ناشکریوں کا کیا حال ہے اور وہ ایک انتہائی عاجز اور بے بس مخلوق ہونے کے باوجود اپنے رب کے سامنے کس طرح اکڑتا ہے۔

اور چونکہ اسلوب بیان تقاضا کر رہا تھا کہ انسان ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کرے اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کا شکر گزار بنے اس وجہ سے اس کے بعد فرمایا: (مَآ اَكْفَرَهٗ) انسان کتنا ناشکرا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ان تمام افضال و عنایات کے باوجود اس کی یہ ناسپاسیاں اور یہ جسارتیں کس قدر حیرت انگیز ہیں۔

مِنْ نُّطْفَةٍ سے لے کر فاقبرہ تک غور کرو تو معلوم ہو گا کہ قرآن نے ان چند لفظوں کے اندر انسانی زندگی کے تینوں مرحلے، اول، اوسط، آخر، پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔

پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اس تھوڑے سے پانی سے پیدا ہوا، جو خدائے حکیم و قدیر کی حکمت و قدرت سے تمام جسم کے اطراف سے چھن چھن کر جمع ہوا۔ اس کے بعد اس پر اللہ تعالیٰ کے تمام تصرفات جاری ہوئے۔ یہ تمام تفصیل جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ لفظ "نُطْفَہ" سے سمجھی جاتی ہے۔

مرحلہ اوسط یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ و فعل کے تمام گوشوں میں جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق و تیسیر سے کرتا ہے۔ بغیر اس کے اس کو کسی چیز پر بھی کوئی قدرت حاصل نہیں ہے۔

آخری مرحلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مارتا ہے اور قبر میں رکھواتا ہے۔ اس سے انسان کی کمال بے بسی اور انتہائی عجز و درماندگی کی حالت ظاہر ہوتی ہے۔

ان حالات کے بعد، جو خدا کی قدرت اور پروردگاری پر مختلف پہلوؤں سے دلیل ہیں، یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ دینے کے لیے ایک دن ضرور اٹھائے گا کیونکہ جو انسان مخلوق و مصنوع ہے اور جس کے لیے زندگی و معیشت کے تمام گوشوں میں خدا نے رہنمائی کا اس قدر وسیع انتظام فرمایا ہے، اس کو اس دنیا میں شتر بے مہار بنا کر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا بلکہ ضروری ہے کہ اس کے لیے پرسش اور جزائے اعمال کا بھی ایک دن آئے اور اس دن وہ اپنے برے اعمال کا برا اور اچھے اعمال کا اچھا بدلہ پائے۔

اب اس پورے سلسلہ پر غور کرو کہ انسان اپنی ابتدا کے روز اول سے لے کر اپنے اٹھائے جانے کے دن تک کس طرح عاجز و درماندہ ہے اور اس کے تمام حالات کس طرح اس کی بے بسی پر دلیل ہیں؛ پھر اس کے باوجود بھی اگر وہ اپنے رب سے بے پروا ہو جائے اور اسی سے منہ پھیر لے جو اس کی زندگی میں اس کے لیے توفیق و رہنمائی کی سب سے بڑی روشنی ہے تو اس کی محرومیوں کا کیا حال ہو گا!

ان دلائل کے بعد کلام ان نشانیوں کی طرف مڑگیا ہے جو انسان اپنے گردوپیش دیکھتا ہے اور جن سے نہایت واضح طور پر ثابت ہے کہ وہ خدا کا مخلوق بندہ ہے اور اسی کی بخشی ہوئی روزی سے پلتا ہے، اور ان کے ذکر کا منشا محض یہ ہے کہ انسان پر اس کی نافرمانی اور ناشکری کی برائی پوری طرح واضح کردی جائے۔ فرمایا:

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴿۲۳﴾ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾

ہرگز اس نے پورا نہ کیا جو اس نے فرمایا۔ انسان اپنی غذا پر نگاہ کرے۔ ہم نے پانی کو گرایا، پھر زمین کو پھاڑا پھر اس میں اگائے اناج، اور انگور اور ساگ، زیتون اور کھجور، گھنے باغ، اور میوے اور دوب، تمھارے اور تمھارے مویشیوں کے برتنے کے لیے۔

۱۰۔ الفاظ کی تفسیر اور جملوں کی تاویل

كَلَّا | انسان کی بے پروائی اور نافرمانی پر زجروتنبیہ ہے۔ بعد کے الفاظ سے اس کی تشریح ہوجاتی ہے۔

لَمَّا يَقْضِ | یعنی اپنی نافرمانی کی حالت پر برابر اصرار کیے جارہا ہے۔

مَآ اَمَرَهٗ | یہ فطرت کے الہامات اور وحی وتنزیل کی ہدایات دونوں کو عام ہے۔ خدا نے انسان کی فطرت میں شکرگزاری اور ہمدردی خلق کا جو جذبہ الہام فرمایا ہے۔ اور انبیاء کے واسطے سے جو اوامر ونواہی بھیجے ہیں سب اس کے تحت آجاتے ہیں۔

اَنَّا | یہ اور اس کے بعد کے جملے طعام سے بدل کے محل میں واقع ہیں۔ یعنی انسان ان تمام چیزوں پر نگاہ کرے۔

صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا | بہت زیادہ پانی بہایا۔ دوسری جگہ فرمایا ہے وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا (اور ہم نے بدلیوں سے دھڑا دھڑ اتا پانی اتارا)

ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا | شق کا لفظ زمین کے لیے مختلف اعتبارات سے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ یہ عمل زمین پر مختلف طریقوں سے واقع ہوتا ہے (۱) جب بارش ہوتی ہے زمین کے مسامات اس کو پی لینے کے لیے کھل جاتے ہیں (۲) زمین کو پھاڑ کر اللہ تعالےٰ نے اس میں نہریں اور ندیاں جاری کردی ہیں۔ چنانچہ عربی میں بحر اور نہر کے الفاظ بھی

اس پر دلالت کرتے ہیں۔ نہرہ کے معنی ہیں فتقہ (اس کو پھاڑا) اسی طرح بجرہ بھی اسی معنی میں آتا ہے (۳) نباتات زمین کے نیچے سے ابھرتی ہیں اور پھر اوپر سے سطح پھٹ جاتی ہے اور طرح طرح کی سبزیاں اور اناج اگ آتے ہیں (۴) کسان بونے سے پہلے ہل کے ذریعہ سے زمین کو پھاڑتا ہے۔

یہاں یہ سارے مفہوم نکلتے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ایک جامع لفظ استعمال فرمایا جو تمام مفہوموں پر حاوی ہوگیا ہے۔

قَضْبًا | وہ نباتات جو کچی حالت میں کھائی جاتے۔ قضب کے معنی کاٹنے کے ہیں۔ غور کرو یہاں لفظ اور اس کے مفہوم میں کس قدر واضح صوتی مناسبت ہے۔ "مضغ" کے لفظ میں بھی، جس کے معنی چبانے کے ہیں، یہ مناسبت پائی جاتی ہے۔ یہ لفظ نہایت جامع ہے اس میں وہ تمام چیزیں آجائیں گی جو کچی اور شاداب حالت میں کھائی جاتی ہیں۔

حَدَآئِقَ | جمع ہے حدیقہ کی۔ حدیقہ کے معنی ہیں گھرا ہوا باغ، اشجار پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

غُلْبًا | 'اغلب' کی جمع ہے۔ اغلب موٹی گردن والے کو کہتے ہیں۔ حدائق کے لیے غُلب کی صفت دو پہلوؤں سے آسکتی ہے۔ یا تو حدائق کو، جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں، اشجار کے معنی میں لیا جائے یا عربی زبان کے مشہور اسلوب کے مطابق یہ مانا جائے کہ شئی کی صفت اس کے متعلق کی صفت سے بیان کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک پہلی صورت زیادہ واضح ہے کیونکہ اس سلسلہ میں جس قدر چیزیں بیان ہوئی ہیں سب نباتات کی قسم کی ہیں۔ اس وجہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حدائق سے اشجار ہی مراد لیے جائیں۔ پھر فعل بھی اَنْۢبَتْنَا (ہم نے اگائے) استعمال ہوا ہے جو اشجار کے معنی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

اَبًّا | 'اب' تروتازہ اور شاداب گھاس۔ یہ اَبَّ يَؤُبُّ اَبًّا وَاِبَابَةً سے ہے جس کے معنی ظاہر ہونے اور نمودار ہونے کے ہیں۔ یہ قدیم مادہ ہے جس پر بعض لسانی تصرفات ہوجانے کے سبب سے بعض حالتوں میں اس کی شکل بدل گئی ہے۔ اور عربی زبان میں یہ تصرفات بہت عام ہیں مثلاً اتم وتم ہبّ وتا ہب، پس 'اب' درحقیقت ہب کی ایک شکل ہے۔ عربی میں اس طرح کے تصرف کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مثلاً ہزّ واز واراق۔ اعشی کا مصرعہ ہے۔ ع

اخ قد طوی کشحا داب لیذھبا

اب یعنی اٹھا اور ارادہ کیا۔ شاداب گھاس کو اب اس لیے کہتے ہیں کہ بارش کے بعد یہ سب سے پہلے نمودار ہوتی ہے۔ اسی سے ابان النبات کا لفظ پیدا ہوگیا۔ پھر کسی قدر توسیع کرکے ابان الشباب بھی بولنے لگے آہستہ آہستہ یہ لفظ ہر چیز کے اوّل وقت کے لیے استعمال ہونے لگا۔

جوہری وغیرہ کا خیال ہے کہ ابان مادہ ابن سے بروزن فعال مبالغہ کا صیغہ ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ابنہ بشیٔ کے معنی ہیں اس کو کسی بات کی تہمت لگائی۔ یہ ابنتہ سے ہے جو اس گرہ کے لیے بولا جاتا ہے جو لکڑی میں ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اب سے فعلان کا صیغہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان نہایت گہری معنوی مناسبت موجود ہے۔ یہ مادہ عبرانی زبان میں بعینہٖ اسی معنی میں پایا جاتا ہے۔ אבב (اب ب) אב (اب) ترکاری اور پھل אביב (ابیب) سبز بالی اور یہودیوں کے پہلے مہینے ربیع کے لیے مستعمل ہے اس لیے کہ وہ نباتات کی روئیدگی

اس شعر میں اس نے اناج کے بعد انگور کا ذکر کیا ہے، اس لیے کہ معیشت کی ضروری چیزوں میں جو جذبہ اہتمام ان دونوں چیزوں کے لیے رکھتے تھے وہ دوسری چیزوں کے لیے نہیں رکھتے تھے۔

اس کے بعد 'قضب' کا ذکر کیا۔ یہ ان تمام چیزوں کے لیے ایک جامع اسم ہے جو تر و تازہ اور کچی حالت میں کھا جائیں۔ قرآن مجید میں قریب قریب یہی ترتیب بعض اور مقامات میں بھی ملحوظ ہے۔ مثلاً فرمایا: لِنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّ (تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے اگائیں اناج اور نباتات)۔

قضب پر ان چیزوں کا بیان ختم ہو جاتا ہے جو جلد نفع پہنچانے والی اور زیادہ سیرابی و آبپاشی کی محتاج ... کے بعد دوسری چیزوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو دیر میں پھل لاتی ہیں اور سیرابی اور آبپاشی کی کچھ ایسی محتاج ... عموماً صرف آسمان کی بارش ان کے لیے کفایت کر جاتی ہے۔ مثلاً عام درخت۔ ان میں زیتون کو سب پر مقدم ... اولاً تو اس کے زیادہ پھل لانے کے سبب سے، ثانیاً اس کی بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے جن کا ذکر ...

اس کے بعد نخل یعنی کھجور کا ذکر فرمایا۔ یہ اہل عرب کے لیے اپنے اندر غذا اور لذت دونوں چیزیں ... ہے۔ یہ ان کے لیے اناج بھی ہے اور میوہ بھی۔ پھر اسی سلسلہ میں تمام پھل والے بڑی قسم کے درختوں ... اس دوسری نوع کی چیزوں کا بیان ختم کر دیا۔

جس ترتیب کے ساتھ ان چیزوں کا بیان قرآن مجید میں آیا ہے۔ بالکل اسی ترتیب کے ساتھ تو... آیا ہے۔ اس میں بھی زمین کی اہم پیداواروں کا جہاں ذکر ہوا ہے، اناج، انگور، زیتون کا بیان بہ ترتیب ... (تثنیہ باب ۲۴: ۱۹-۲۱ و باب ۲۸: ۳۸-۴۰) البتہ کھجور کا ذکر چھوڑ دیا ہے اس لیے کہ شام کھجور ... کے لیے کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔ یہ عرب کی مخصوص چیز ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ عرب کی اصلی پیداوار ... یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کا ذکر اناج کے ساتھ ملتا ہے۔ مثلاً فرمایا: فِیْ جَنّٰتٍ وَّ ... نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ (باغوں، چشموں، کھیتیوں اور کھجوروں میں جن کے خوشے تہ بہ تہ ہیں) ... مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ... مبارک پانی اتارا اور اس سے باغ اور کاٹنے کے غلے اگائے اور لمبے لمبے کھجوروں کے درخت ... لگے ہوئے) ایک جگہ فرمایا: وَجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ (انگوروں کے باغ اور کھ...

غرض ان دونوں میں وہ تمام چیزیں سمٹ گئی ہیں جن کو انسان بوتا اور لگاتا ہے۔ ... جامع زرع کا بیان کیا جس کے دو لفظوں میں زمین کی تمام باقی نباتات آگئیں۔ یعنی فاکہہ ... انسان کے لیے ہے، دوسری چوپایوں کے لیے ہے چنانچہ اس کی تصریح بھی فرما دی۔ مَتَاعًا ... (تمھارے لیے اور تمھارے چوپایوں کے لیے) یہ ایک مخصوص اسلوب ہے جو کسی سلسلہ کے بعد ... لیے آتا ہے کہ اس سلسلہ کی بقیہ تمام چیزوں کو سمیٹ کر اس پر تکمیل کی مہر لگا دے۔ قرآن مجید میں ... مثالیں بہت ملتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ (میں قسم...

جن کو تم دیکھتے ہو اور جن کو تم نہیں دیکھتے ہو) ایک جگہ بہت سے انبیاء کا نام ذکر کرنے کے بعد فرمایا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ الآیۃ (بہت سے انبیاء ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو سنا دیے اور بہت سے ایسے ہیں جن کے حالات ہم نے تم کو نہیں سنائے) اسی طرح بہت سے بارکش جانوروں مثلاً گھوڑے، خچر اور گدھے وغیرہ کے ذکر کے بعد فرمایا وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (اور بہت سی ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کو تم نہیں جانتے)

۱۲۔ ان آیات کا تعلق آگے اور پیچھے سے

اس یاددہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو اور ہمارے چوپایوں کو جو روزی مل رہی ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہے پس ہمارا تمام تر انحصار اسی کی ذات پر ہے۔ وہی ہے جس نے حیوانات کو ہمارا محکوم اور خدمت گار بنا دیا ہے اور پھر جس طرح ہم خدا کے بخشے ہوئے رزق سے پلتے ہیں۔ اسی طرح وہ بھی خدا کے خزانہ جود ہی سے روزی پاتے ہیں۔ پس یہ کیسی بدبختی اور نالائقی کی بات ہے کہ ان انعامات و افضال کے باوجود ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے سرتابی کریں۔

اس تعلیم کی نظیر پچھلی سورہ میں گزر چکی ہے۔ اس وجہ سے یہاں ہم اس کا صرف اتنا ہی حصہ بیان کرنا چاہتے ہیں جس سے ان آیات کا تعلق آگے اور پیچھے سے واضح ہو جائے۔ تمام تفصیلات کو دوبارہ دہرانا غیر ضروری ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ٹکڑوں میں ایک بات بطور قدر مشترک کے موجود ہے۔ یعنی ان میں انسان کی خدا سے بے پروائی اور اس کی سرکشی پر اس کو سرزنش کی گئی ہے لیکن دونوں میں سرزنش کے پہلو کسی قدر مختلف ہو گئے ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں انسان کے کفر و انکار پر سرزنش ہے اور اس دوسرے ٹکڑے میں اس کی ناسپاسی اور ناشکری کا پہلو پیش نظر ہے۔ اور ساتھ ہی ان میں اللہ تعالیٰ کی پروردگاری اور قیامت کے دن انسان کے اٹھائے جانے کی ایسی دلیلیں بھی چھپی ہوئی ہیں جن سے جزا و سزا پر ایمان کی طرف رہبری ہوتی ہے۔

علاوہ بریں ایک اور پہلو بھی پیش نظر رکھیے۔ ان آیات میں زندگی اور معیشت کے جن سامانوں اور نعمتوں کا ذکر فرمایا ہے، ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ دنیا و آخرت کی زندگی کی ایک نہایت جامع مثال ہے یہی مثال مندرجہ ذیل آیت میں بھی بیان ہوئی ہے۔ اس وجہ سے اس آیت پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ
مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ
فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ اِنَّمَا
مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ
مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰۤى
اِذَاۤ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا

اے لوگو! تمھاری سرکشی کا وبال تمھاری ہی جانوں پر آئے گا
دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے اڑا لو پھر ہماری ہی طرف
تم کو لوٹنا ہے اور ہم تم کو خبر دیں گے ان چیزوں کی جو تم کرتے
رہے ہو۔ دنیا کی زندگی کی مثال تو بس ایسی ہے کہ جس
طرح پانی کہ جس کو ہم نے برسایا آسمان سے پس زمین کی
نباتات جن کو آدمی اور چارپائے کھاتے ہیں اس سے
ابھریں۔ یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا سنگار کر لیا اور

وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (یونس - ۲۳-۲۴)

وہ خوش نما ہوگئی اور اس کے مالکوں نے سمجھا کہ وہ اب اس پر قادر ہیں آیا ہمارا حکم اس پر رات کے وقت یا دن کے وقت پس ہم نے اس طرح اس کا ستھراؤ کر دیا گویا کل وہ کچھ تھے ہی نہیں۔ ایسی ہی ہم اپنی آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں سوچنے والوں کے لیے۔

چنانچہ اس مقام کی اسی پوشیدہ حقیقت کے اقتضاء سے اس کے فوراً بعد قیامت اور روز جزاء کا بیان شروع ہوگیا۔ ان آیات کے مطالعہ سے یہ امر بھی واضح ہوگیا کہ قرآن مجید میں جو آیتیں ترغیب و ترہیب کے لیے آتی ہیں۔ ان میں بھی استدلال کا زور پوری طرح موجود ہوتا ہے اور یہ قرآن کا نہایت عام اسلوب ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾

پھر جب وہ سخت آواز آئے گی۔ جس دن کہ آدمی اپنے بھائی سے بھاگے گا، اور اپنے ماں باپ سے، اور اپنی بیوی اور بیٹے سے، اس روز ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ بہت سے چہرے اس روز روشن ہوں گے، ہنستے اور خوش ہوتے۔ اور بہت سے چہروں پر اس روز خاک اڑتی ہوگی، اور ان پر سیاہی چھائی ہوئی ہوگی۔ یہی ہوں گے کافر اور بدکار لوگ۔

۱۳- الفاظ اور جملوں کی تاویل

(از آیت ۳۳ تا ۴۲)

الصَّآخَّةُ | عربی میں صخ سمعہ کے معنی ہوں گے اصمہ یعنی اس کے کان بہرے کر دیئے۔ پس قیامت کے لیے

صاخۃ (بہری کر دینے والی آواز) کا لفظ اس کی دو مخصوص حالتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ایک تو اس کی اس پہلی سخت و شدید کڑک کی طرف جو کانوں کو بہرا کر دینے والی ہوگی۔ دوسرے اس کی اس ہولناکی کی طرف جو ہر شخص کو اس کے نفس کے سوا ہر چیز سے غافل کر دے گی۔ قیامت کی اس حالت کی تصویر بعض آیات میں کھینچی گئی ہے يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى (جس دن کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کو بھول جائے گی اور ہر حاملہ اپنا حمل ڈال دے گی اور تم لوگوں کو بالکل مدہوش پاؤ گے) اور عربی زبان میں جب کسی بڑی مصیبت کی شدت بیان کرنا چاہیں گے تو کہیں گے "لا ینادی ولیدھا" "ایسی سخت مصیبت کہ مائیں اپنے بچوں کو بھول گئیں۔" 'صاخۃ' کے لفظ میں قیامت کی یہ دونوں حالتیں بیان ہوئی ہیں۔ اور چونکہ یہ لفظ پہلے مفہوم میں بالکل واضح تھا اس وجہ سے قرآن نے اس کی کوئی تفصیل نہیں کی لیکن دوسرے مفہوم کی طرف بغیر کسی اشارہ کے بے تکلف ذہن نہیں منتقل ہو سکتا تھا اس وجہ سے قرآن نے يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ الآیہ سے لے کر لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ تک اس کی تشریح کی۔

يَفِرُّ | یہ قیامت کی ہولناکی کے لیے ایک پر کنایہ طریق تعبیر ہے۔ یہ دن ایسا ہوگا کہ ہر شخص کو اپنی پڑی ہوگی۔ دوسروں کی حالت کی طرف توجہ کرنے کے لیے اس کو فرصت نہ ملے گی۔ بعد کے جملوں میں اس کی پوری تشریح ہوگئی ہے۔

مُّسْفِرَةٌ | یہ "اسفر الصبح" سے لیا گیا ہے۔ یعنی روشن، تابناک۔ مسرت کی پہلی چمک جو اہل جنت کے چہروں پر نمایاں ہوگی، یہ لفظ اس کو ظاہر کر رہا ہے۔ بعد کے الفاظ سے اس کی تشریح ہوگئی ہے۔

ضَاحِكَةٌ | یہ مسرت سے کنایہ ہے چنانچہ بعد کے لفظ نے اس کو کھول دیا ہے۔ اہل ایمان کو امن و سلامتی اور قرب و وصال کی دولت پا کر جو بشاشت حاصل ہوگی اس کو ضحک کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مُّسْتَبْشِرَةٌ | اس لفظ نے معاملہ کو ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں جو اہل جنت کے لیے تیار ہوں گی ان کو دیکھ کر جو بشاشت یقین ان کے چہروں پر نمایاں ہوگی، یہ لفظ اس کو ظاہر کر رہا ہے۔

عَلَيْهَا غَبَرَةٌ | یہ مسفرۃ کا متقابل اور ذلت و غم سے کنایہ ہے۔ یہ کنایہ قرآن مجید میں دوسرے مقام پر بھی موجود ہے وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ۔ امراء القیس نے بھی اس کنایہ کو استعمال کیا ہے۔

علیہ القتام، سیئ الظن والبال　　اس پر سیاہی چھائی ہوئی تھی اور وہ بدگمان اور بدحال تھا

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ | ان پر سیاہی چھا رہی ہوگی۔ یہ لفظ غبرۃ سے زیادہ مختلف ہے۔ یعنی پہلے ان پر خاک اڑے گی۔ پھر سیاہی چھائے گی۔ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ٹھیک ٹھیک مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ کا متقابل ہے۔ اس تقابل کی مثال دوسری جگہ بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ (جس دن کہ بہت سے چہرے روشن ہوں گے اور بہت سے چہرے سیاہ)

الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ | اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے منکر، اس کی نعمتوں کے ناشکر گزار، اس کے حکموں سے بغاوت کرنے والے۔

اس سے اوپر انسان کے کفر و ناسپاسی کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا۔ ان دو لفظوں کے اندر اسی تفصیل کو سمیٹ دیا ہے۔

۱۴۔ ایک لطیف نکتہ

قرآن مجید جن چیزوں کو بیان کرتا ہے ان کی باہمی ترتیب میں ایک خاص حکمت ملحوظ ہوتی ہے ہم یہاں اسی طرح کے ایک حکیمانہ نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس سورہ میں غور کرو گے تو یہ بات نظر آئے گی کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی صفات خیر و شر کو مقابلہ کے اصول پر ایک خاص ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے، صفات خیر میں تزکی، تذکر اور خشیت کو بیان فرمایا ہے اور صفات شر میں سے استغنا، کفر اور فجور کو۔

پہلے تزکی، تذکر، خشیت کی تینوں حالتوں پر غور کرو۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اوپر سے نیچے اترنے والی ترتیب ملحوظ ہے۔ تزکی، خشیت کی آخری منزل ہے، اس کو پہلے بیان فرمایا ہے اور خشیت کو جو اس راہ کا نقطۂ آغاز ہے سب سے آخر میں لائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ایمان و تقویٰ کا سفر ایک متعین منزل مقصود کی طرف ہوتا ہے۔ وہ سفر کے آغاز ہی میں منزل مقصود طے کر لیتے ہیں اور لنگر اٹھانے سے پہلے ساحل کی سمت متعین کر لیتے ہیں اس وجہ سے ضروری ہوا کہ قرآن مجید اس حقیقت کو بیان کرنے میں ایسی ترتیب اختیار فرمائے جو اہل ایمان و تقویٰ کی اس ذہنی حالت کو واضح کر سکے۔

برعکس اس کے صفات شر کے بیان کرنے میں ترتیب بالکل دوسری اختیار کی گئی ہے۔ اس میں نیچے سے اوپر چڑھنے والی ترتیب ہے یعنی استغنا کو جو شقاوت کا پہلا زینہ ہے، پہلے بیان کیا اور فجور کو جو بالکل آخری حالت ہے سب کے آخر میں لائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ارباب فسق و فجور اپنی آخری منزل سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ وہ نفس کے اشارہ سے قدم اٹھا دیتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے کہ کہاں جا رہے ہیں۔ بالآخر آہستہ آہستہ قعر ہلاکت تک پہنچ جاتے ہیں جو ایسے لوگوں کے لیے مقدر ہے۔

یہ نکتہ تھا جس کی وجہ سے دونوں ترتیبوں میں اختلاف ہوا۔ اب دونوں ترتیبوں کے تدریجی لزوم پر غور کرو۔ پہلی ترتیب میں سب سے پہلے خشیت ہے اس لیے کہ یہ تمام فوز و فلاح کی اصل ہے۔ یہ آدمی کو تذکر پر ابھارتی ہے اور تذکر تزکیہ کی طرف رہبری کرتا ہے جو اصل مقصود ہے۔ دوسری میں استغنا سب سے مقدم ہے کیونکہ یہی تمام فساد کی جڑ ہے۔ یہ انکار حق پر آمادہ کرتا ہے اور انکار حق فسق و فجور کا دروازہ ہے۔

ہم نے جو ترتیب بیان کی ہے، اگر ہم چاہیں تو اس پر قرآن مجید سے بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں لیکن ہماری اس کتاب میں اس کی مثالیں ایک سے زیادہ مقامات میں گزر چکی ہیں۔ اہل نظر خود بخود اس پر پوری طرح مطمئن ہو جائیں گے۔

۱۵۔ پوری سورہ کے نظم پر ایک اجمالی نظر

پچھلے مباحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس سورہ کے ابتدائی حصہ میں کافروں اور فاسقوں کو بطریق تعریض ملامت کی گئی ہے تاکہ ان کی غفلت کی نیند ٹوٹے اور وہ آنکھیں کھولیں۔ یہ مضمون ابتدائی دس آیتوں میں پھیلا ہوا ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید کی عظمت و منزلت کا بیان شروع ہوتا ہے کہ وہ پاک اور بلند ہے، عزت والے فرشتوں کے ہاتھ میں ہے، اللہ تعالیٰ نے محض اپنے بندوں پر فضل و احسان فرمانے کے لیے اس کو اتارا ہے۔ اس وجہ سے وہی لوگ اس کے مستحق ہو سکتے ہیں جو اس کی قدر و قیمت پہچانیں۔ ناقدروں اور منکروں کے لیے یہ نعمت گراں مایہ نہیں ہے۔ یہ مضمون سولھویں آیت تک آتا ہے۔

اس کے بعد دو فقرے دہرے ہیں۔ ان میں اپنی نعمتوں اور اپنی قدرت کو اس طرح بیان فرمایا جس سے انسان کی بے بسی اور اس کی احتیاج واضح ہوتی ہے اور مقصود اس کے بیان کرنے سے یہ ہے کہ انسان پر اس کی ناشکری اور ناسپاسی کی برائی اچھی طرح واضح ہو جائے۔ پہلے فقرے میں ان نعمتوں کو بیان فرمایا ہے جو انسان اپنے نفس کے اندر پاتا ہے۔ یہ فقرہ بائیسویں آیت پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرے فقرے میں وہ نعمتیں بیان ہوئی ہیں جو اس عالم میں انسان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور جن پر اس کی زندگی اور بقا کا دار و مدار ہے یہ فقرہ بتیسویں آیت تک آتا ہے۔

پہلے فقرہ کو قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ سے شروع کیا اور دوسرے کو كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ سے ان دونوں کو ترتیب پیش نظر رکھو تو خلاصہ مطلب یہ نکلے گا کہ اس انسان کے کفر کا معاملہ کتنا عجیب ہے جس کا خود اپنا وجود، اس کے بندہ ہونے، اس کے عاجز و بے بس ہونے، اس کے محتاج و دست نگر ہونے اور پھر حشر و نشر و قیامت اور جزا پر سب سے بڑی دلیل ہے اور اس کی ناسپاسی اور نافرمانی کس قدر قابل ملامت ہے جس کے وجود اور جس کی زندگی کا ایک ایک ریشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور نوازشوں سے پل رہا ہے، اور وہ ان تمام باتوں کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ بھی رہا ہے۔

پس ناشکری اور انکار دونوں باتوں کا ذکر یہاں ساتھ ساتھ بالکل اسی اصول کے مطابق ہوا ہے جس اصول کے مطابق ایمان اور عمل صالح کا ذکر ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ یہ بالکل عقلی ترتیب ہے، کیونکہ اعمال بالکل عقائد اور اخلاق کے تابع ہوتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس اصول کی طرف جا بجا اشارات کیے ہیں۔ مثلاً

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ	بھلا دیکھو تو اس کو جو روز جزاء کو جھٹلاتا ہے۔ وہی ہے جو
الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ۔	یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

یعنی یتیم کو دھکے دینے کی سنگدلی اس میں اس وجہ سے پیدا ہو گئی ہے کہ وہ جزا کے دن کا منکر ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ یتیم کے ساتھ یہ معاملہ نہ کرتا۔ قرآن مجید میں مختلف پیرایوں سے یہ اصول بار بار بیان ہوا ہے۔

اب ان دونوں فقروں کے خلاصہ مفہوم کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لو۔ پوری تقریر گویا اس طرح ہے کہ انسان کا معاملہ عجیب ہے، وہ اپنے ظاہر و باطن کو خدا کی بے شمار نعمتوں سے گھرا ہوا پاتا ہے، پھر بھی نہایت بے پروائی کے ساتھ، اس بات کا منکر ہے کہ وہ ایک دن اپنے کاموں کی جواب دہی کے لیے اٹھایا جائے گا۔ یہ کفر و ناسپاسی کی ایک بالکل ہی حیرت میں ڈال دینے والی حالت ہے۔ آخر وہ کس چیز کا منکر ہے؟ کیا خدا کی ان بے شمار نعمتوں کا جس کی شہادت اس کے وجود کے ریشہ ریشہ کے اندر سے بول رہی ہے؟ کیا اس کی اس اچنبھے میں ڈال دینے والی قدرت کا جس کے عجائب سے اس کائنات کا کوئی گوشہ بھی خالی نہیں؟ پھر جب یہ دونوں باتیں موجود ہیں، اور ان میں سے کسی ایک بات سے بھی اس کو انکار نہیں ہے۔ تو پھر اس کو بدلہ اور عذاب و ثواب کے ایک ناگزیر اور اٹل دن سے کیوں انکار ہے؟ یہ تو خدا کی نعمتوں اور قدرتوں کا ایک لازمی نتیجہ ہے کہ عذاب و ثواب کا ایک دن آئے۔

کیا انسان چاہتا ہے کہ وہ خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں سے پوری طرح فائدہ اٹھائے لیکن ذمہ داری اور مسئولیت کا کوئی بار نہ اٹھائے، بہ اس کی بخششوں کے خوان کرم پر عیش کرے اور پھر اس کے حکموں کو پوری بے دردی کے ساتھ ٹھکراتا رہے؟ یہ تو کفر و ناسپاسی کی نہایت مکروہ صورت ہے جو انسان نے اختیار کر لی ہے۔

انسان کی شقاوت کے یہ دونوں گوشے جواب تک تمہیں بیان میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں، سورہ کے آخر میں آکر بالکل ایک نقطہ پر سمٹ گئے ہیں۔ فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ (یہی ہیں کافر اور بدکار لوگ)

انسان کے اس دنیا میں فقر و احتیاج اور اس کے اوپر اپنے افضال و عنایات اور اپنی قدرت کو بیان کرنے کے بعد اس کے اس فقر و احتیاج کو بیان فرمایا جس سے وہ اس زندگی کے بعد دوچار ہوگا جب کہ موجودہ سروسامان معیشت کی تمام خوش عیشیاں، جو آج غفلت و مدہوشی کا سبب بنی ہوئی ہیں، ختم ہو چکی ہوں گی۔ چنانچہ یہ مضمون شروع ہوا اور یہ آیت ۳۲ تک آیا۔

اور جس طرح پہلے فقرہ میں حشر و نشر کے ذکر کے ساتھ ایسی چیزیں بیان ہوئیں جو حشر و نشر پر دلیل تھیں، اسی طرح قیامت کے ذکر کے ساتھ ایسے امور کا بیان ہوا جو قیامت پر دلیل ہیں۔ چنانچہ انسان کی خلقت کے ذکر کے بعد جس طرح فرمایا ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ (جب اس کو چاہے گا اٹھا کھڑا کرے گا) اسی طرح اس کے رزق کے بیان کے بعد فرمایا، فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ (جب وہ بہری کر دینے والی آئے گی) کیونکہ انسان جب اپنی خلقت کے معاملہ پر غور کرے گا تو اس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ جو خدا اس کو پیدا کر سکتا ہے وہ اس کو دوبارہ اٹھا بھی سکتا ہے۔ اسی طرح جب وہ اپنے رب کے انعامات کے معاملہ پر غور کرے گا تو اس میں اس امر کا یقین تازہ ہوگا کہ اس کے سامنے مسئولیت اور بازپرس کا بھی ایک دن آئے گا اور اسے اپنے مولیٰ اور پروردگار کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا۔ سورہ مرسلات میں اس اسلوب کی نہایت عمدہ مثال موجود ہے۔

اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۝ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ۝ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ۝ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ۝ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝

کیا ہم نے تم کو ایک بے حقیقت پانی سے نہیں بنایا؟ اور پھر اسے ایک آرام کی جگہ میں رکھا۔ ایک مقررہ زمانہ تک، ہم نے مقرر کیا، کیا خوب ہم مقرر کرتے ہیں آج منکروں کی خرابی ہے (یعنی حشر و نشر کے منکروں کی) کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟ زندہ کو اور مردہ کو اور اس میں گڑے ہوئے اونچے پہاڑ بنائے اور تمہیں خوشگوار پانی پلایا، آج منکروں کی خرابی ہے (یعنی روز جزا کے منکروں کی)

دوسرے مقامات میں بھی اس کی نظریں موجود ہیں:

انسان کے فقر و احتیاج اور اس کے کفر و فجور اور استغناء کی برائی بیان کرنے کے بعد دونوں فریق یعنی ارباب خشیت و تقویٰ اور اہل کفر و فجور اور مآل اور انجام کے بیان پر سورہ کو ختم کیا اور انہی کے بیان سے سورہ شروع ہوئی تھی۔ یہ مضمون آیت ۴۲ پر ختم ہوتا ہے جو سورہ کی آخری آیت ہے۔

اب پوری سورہ پر غور کر کے دیکھو کہ چند آیتوں کے اندر انسان کی بے پروائی اور کفر و انکار کی حالت اور اس کے ضعف و احتیاج کی بے بسی اور اللہ تعالیٰ کے افضال و عنایات کی داستان کس خوبی و بلاغت اور کس شان اعجاز کے ساتھ بیان ہو گئی ہے اور کس طرح یہ امر واضح ہو رہا ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے اور اسلوب بیان ایسا اختیار فرمایا ہے جس سے خود بخود یہ مترشح ہو رہا ہے کہ اس میں آنحضرت صلعم کو تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ آپ ان بے پروا بدبختوں کو چھوڑ کر صرف ان لوگوں کو اپنی تمام توجہ اور شفقت کا مرکز بنائیں جو اس نعمت عظمیٰ کے مستحق ہیں۔